وادیٔ گریز

(حصہ اول)

محمد رمضان خان

وادیٔ گریز

(حصہ اول)

محمد رمضان خان

مصنف: محمد رمضان خان، اچھورہ، گریز

سال طباعت: جنوری ۲۰۰۸ء

قیمت: Rs. 100/-

ملنے کا پتہ:

(۱) حبہ خاتون، انگلش میڈیم سکول، داور، گریز

(۲) لون سٹیشنری، داور، گریز

(۳) پپو سٹیشنری، کورٹ روڈ، بانڈی پورہ

(۴) جے۔این۔آئی۔انٹرپرائز، حارون کمپلکس، ایکس چینج روڈ، سرینگر

(۵) ایور گرین ایجنسیز، حارون کمپلکس، ایکس چینج روڈ، سرینگر



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

وادی گریز ایک حسین اور جمیل وادی ہے۔ اونچے اونچے پہاڑوں اور سر سبز چراگاہوں سے گھری اس وادی کا کہیں کسی کتاب میں کوئی مفصل تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ چند انگریز سیاحوں نے اپنے سفر ناموں وغیرہ میں اس کا کچھ ذکر ضرور کیا ہے۔ اس لئے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اپنی اس حسین وادی کے بارے میں ایک تعارفی پیغام لوگوں تک پہنچا کر اس کے بارے میں واقفیت دلائی جائے۔ جب یہ کتابچہ قارئین کے ہاتھ میں ہوگا تو اس وقت قارئین حضرات تنقید کے بجائے اس کتابچہ میں تعمیری نکات تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ تاکہ انشااللہ آئندہ اس کو ایک مکمل کتاب کی شکل دی جاسکے۔ میں نے یہ صرف ایک کوشش کی ہے۔ یہ کوئی حرف آخر نہیں ہے۔ قلم کار حضرات کے لئے یہ ایک Inspiration کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ خلوص کے ساتھ اس میں خامیوں کی نشاندہی کر کے اس کو آئندہ ایڈیشن میں مزید دلچسپ بنانے میں میری بھرپور مدد کریں گے۔

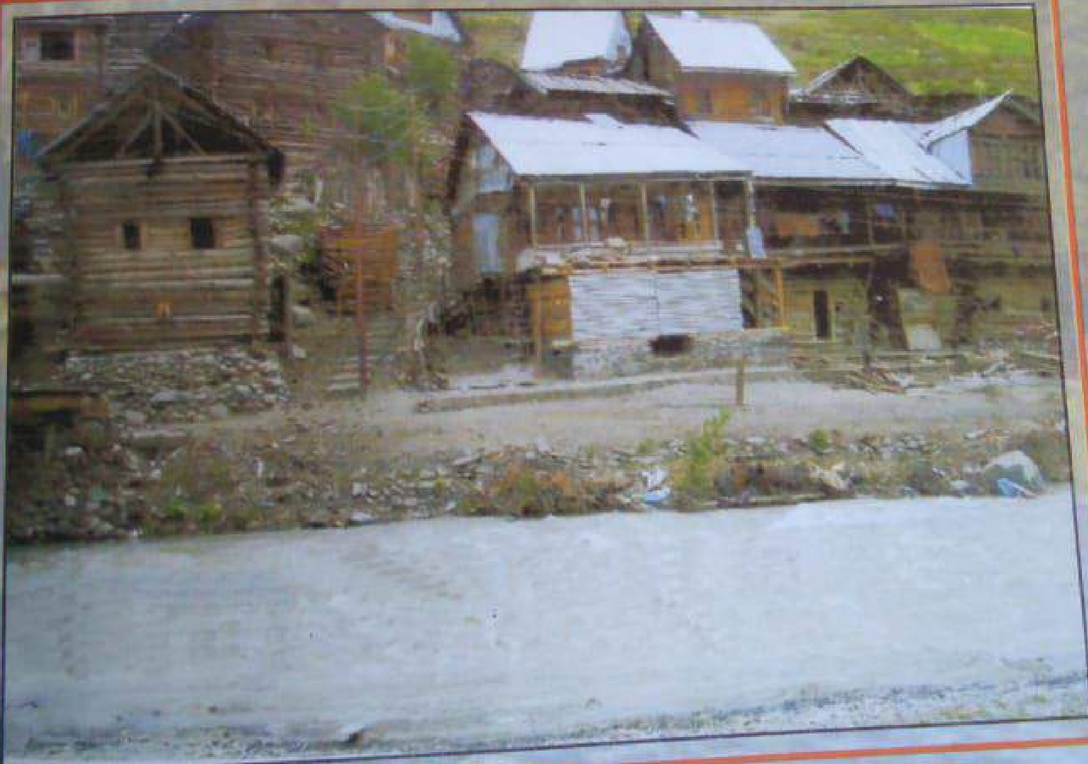
والسلام

محمد رمضان خان

اچھورہ گریز



Two Spritual Persons of Achoora Gurez
Faquirallah Lone & Rahmatullah Lone (Left to Right)



Proposed F.P. works on Kishan Ganga left side of Gujaran Village
(under C.D.F.)



PWD Dak Bunglow at Badwan Gurez Constructed in 1931 A.D. used by resident of Gilgit during his stay in Gurez



An Astabals used by Maharajas before partition during their third parau enroute to Gilgit



A view of Gurez Valley



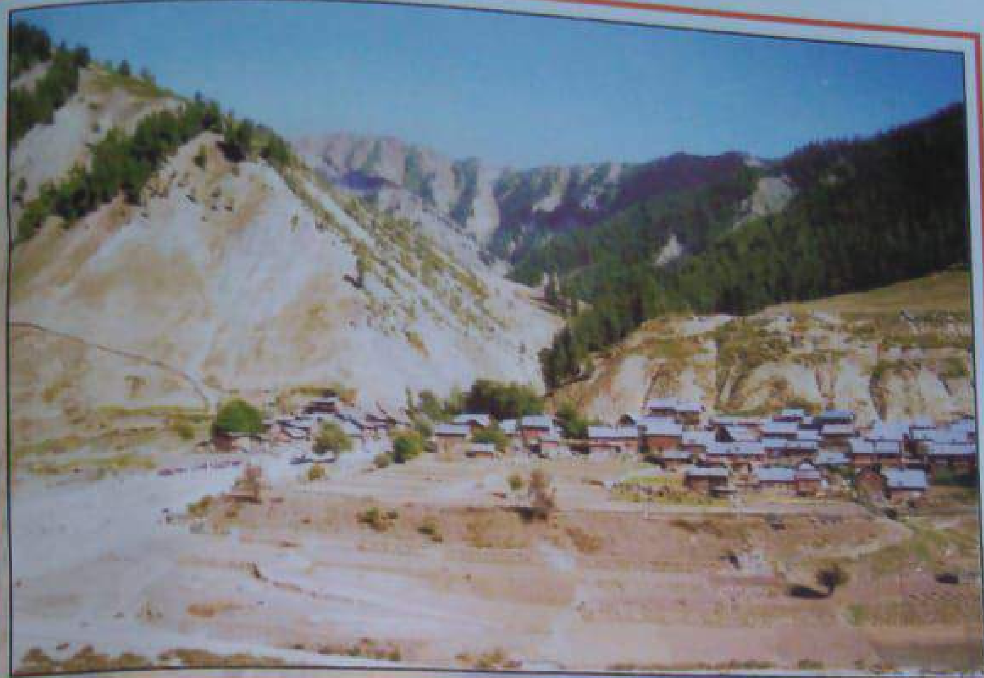
A view of Gurez Valley



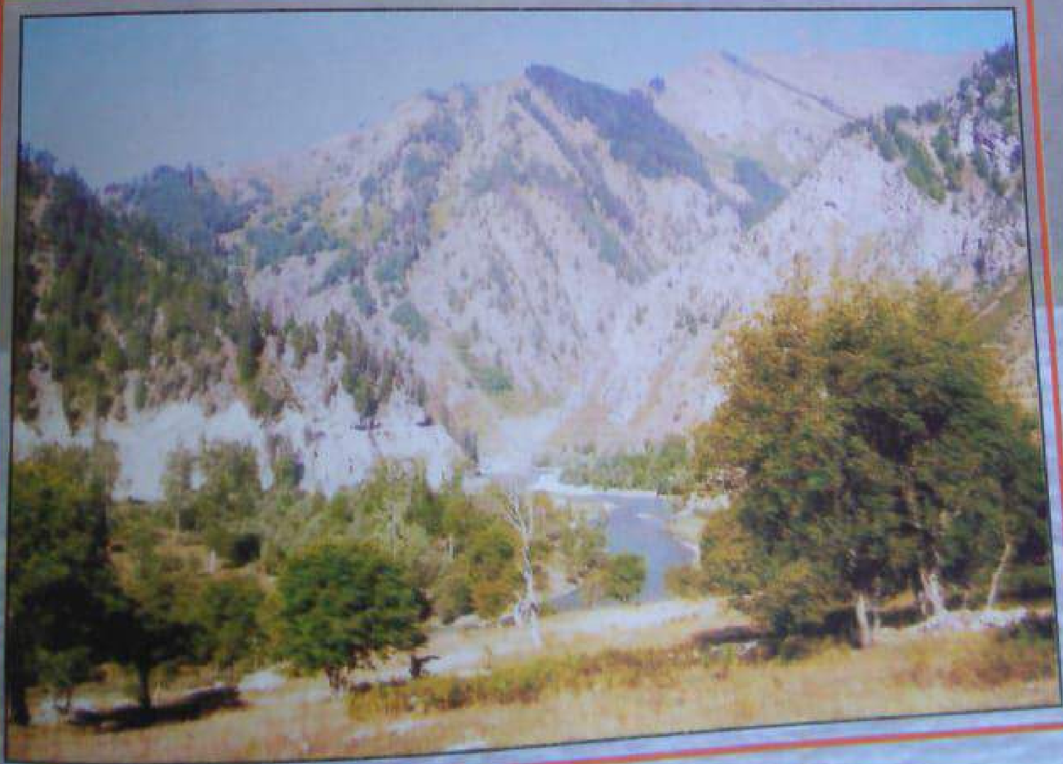
Peer Baba Ziyarat Razdhan



Razdhan Pass



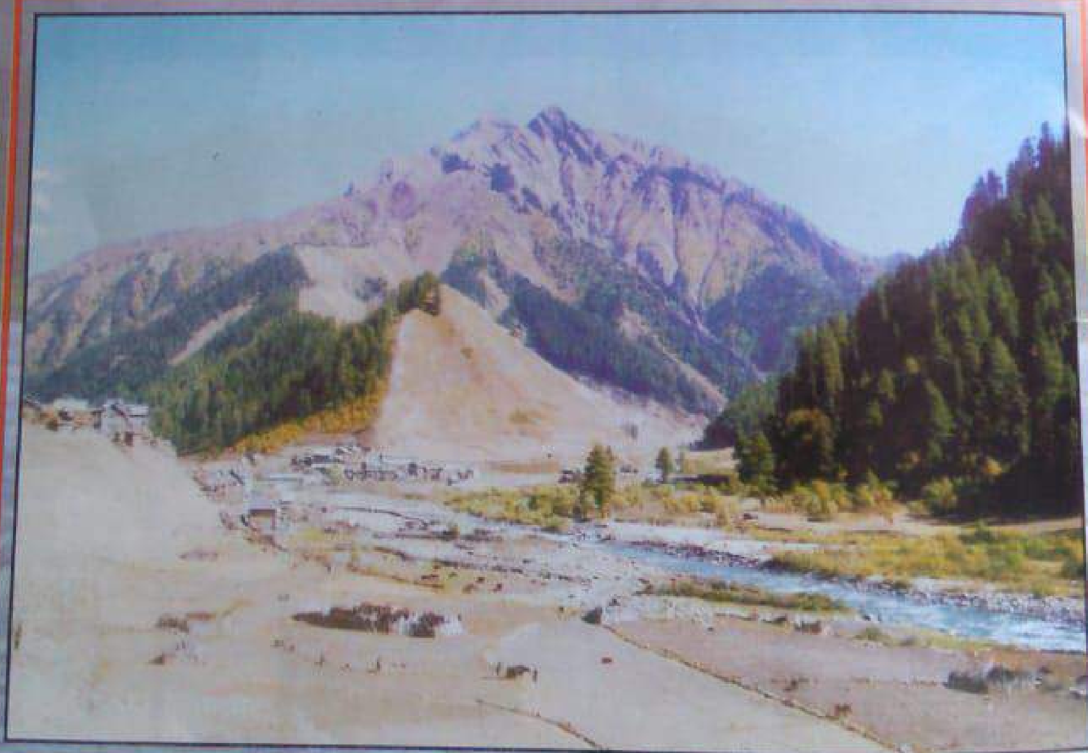
Chorwan Village



Badwan Parri



Habba Khatoon Spring



Baduab Telial



Dak Bunglow Dawar Gurez



Khandyal Village in winter

تاثرات

جناب محمد دلبر خان صاحب اچھورہ

وادی گریز اگرچہ ریاست جموں و کشمیر کا یاک دُور افتادہ علاقہ ہے لیکن تاریخی، سیاسی اور سیاحتی اعتبار سے ایک مخصوص مقام کا حامل ہے۔ ریاست کی نوے فیصد آبادی اس علاقے سے متعارف نہیں۔ اس سلسلے میں جناب محمد رمضان خان صاحب نے جو کوشش اس کتابچے کی صورت میں کی وہ قابلِ تعریف ہے۔ کتابچے میں چند ادبی خامیاں ضرور ہیں۔ کتابچے میں تسلسل کی کمی ضرور جھلکتی ہے تاہم اُن کی اولین کوشش قابلِ ستائش ہے۔



تاثرات

مفتی محمد سلطان جگلندر، تلیل گریز

وادی گریز و تلیل ایسی دو خوبصورت وادیاں ہیں جو اپنی رعنائی میں بے مثال ہیں۔ بدقسمتی یہ اس کی تلیل و گریز کی سرزمین جدید برقی روشنی سے ہمیشہ محروم رہی، یہی وجہ ہے کہ آج بھی کوئی ایسی ترقی علاقہ میں نہیں ہے جسکو بطور فخر پیش کیا جائے۔

محسوس ہوتا ہے کہ لفظ تلیل کا اثر "علاقہ تلیل" پر پڑا ہے جو لیل سے ماخوذ ہے جسکے عربی لغت میں معنی اندھیرے کے ہیں۔ تاہم ان گذشتہ پندرہ برسوں کے دوران وادی گریز و تلیل کے کچھ افراد اپنی ذاتی محنتوں و کاوشوں کی بدولت تعلیمی میدان میں اتنے آگے بڑھے کہ جن کا نام ریاست کی گنی چُنی شخصیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلکہ جن افراد کو مرکزی سطح پر اعزازی مناصب ہامہ پر فائز کیا گیا ہے ان میں سرفہرست وہ حضرات شامل ہیں جن کا تعلق اس وادی سے ہے۔

میدانِ صحافت ایک وسیع اور اہم ترین میدان ہے۔ اس میدان میں بھی اگر تلیل و گریز کی وادیوں میں کسی کی خدماتِ جلیلہ تلاش کی جائیں تو "اشرف ساحل" کی شکل میں یقیناً مل جائینگی۔

واہ اسفا

اس سرزمین سے وجود میں آنے والی شخصیات خواہ وہ صحافی میدان سے تعلق رکھتی ہوں یا علماے کی صفت میں شامل ہوں یا دوسرے عظیم عہدوں پر فائز ہوں اپنے عزیز وطن

(گریز و تلیل) کیلئے کوئی خاطر خواہ کام نہ کر سکیں۔

یہ سرزمین زرخیز و سرسبز و شاداب زمین ہے۔ جہاں اللہ نے تقریباً ایک سوتیس کلومیٹر پر پھیلے ہوئے اُس علاقہ کو پہاڑوں، کوہساروں، بلند چوٹیوں، ندیوں نالوں اور ہمہ جہت پھوٹنے والے چشموں اور آبشاروں سے حسن کی عظیم دولت سے نوازا۔ وہی پر یہاں سے ایسے افراد وجود میں آئے جنھوں نے اپنے قلم و ذہانت سے اس خوبصورتی میں اضافہ کیا۔

ان ہی اہل قلم میں جناب محمد رمضان صاحب اچھورہ کا بھی شمار ہوتا ہے جو اپنی لیاقت، اخلاق، تقریر و تحریر میں محتاجِ تعارف قطعاً نہیں ہیں۔ اس صلاحیت کا نتیجہ ہے کہ موصوف کے قلم سے وادی گریز کا تعارف ایک کتابچہ کی شکل میں قارئین کی سامنے ہے۔

اس کاوش پر یقیناً موصوف قابل مبارک باد ہیں اس امید کے ساتھ کہ مستقبل میں اجمال کو تفصیل سے بدل دینگے۔



تاثرات

حضرت مفتی نذیر احمد قاسمی، داور گریز

زیر نظر کتاب ''وادی گریس'' معروف معنوں میں کوئی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ مضامین کا مجموعہ ہے جو محترم محمد رمضان خان صاحب نے وادی گُریس کے عنوان سے وقتاً فوقتاً مرتب کئے ہیں۔ان میں اکثر مضامین کو چند رسائل واخبارات میں مولف نے شائع بھی کرایا اب مولف نے اُن کو اس مجموعہ میں اکٹھا کر دیا اور ''وادی گریس'' کے نام سے چھاپا ہے جو ایک خوش آیند کام ہے۔

ان مضامین کا مطالعہ میں نے ان ایام میں کیا جب یہ مضامین اخبارات میں شائع ہوئے چند مضامین کو پھر سے پڑھنے کا موقع ملا۔مضامین بڑے فکر انگیز اور غور طلب ہیں کینوکہ ان کے لکھنے میں مولف کے دلی جذبات بھی شامل ہے اس لئے وہ ''از دل خیز بر دل زبرد'' کے بمصداق قوت تاثیر رکھتے ہیں۔بات جب دل سے نکلتی ہے تو یقیناً اثر رکھتی ہے۔ انداز بیان سلیس، سادہ عام فہم اور پُرکشش ہے۔موصوف شعبہ انیمل ہسبنڈری سے وابسطہ رہا مگر اُس کے باوجود علمی وادبی، سیاسی و ماحولیاتی سرگرمیوں سیمناروں، گریس کے ثقافتی اور کلچرل پروگراموں کا انعقاد کرتے رہے۔اُن کی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے ڈاکٹر گرجہ دھر صاحبہ سابقہ چیر پرسن جموں کشمیر کمیشن برائے خواتین، نے انہیں کمیشن کے لئے تحصیل گریز کے لئے گروپ ممبر بنایا۔انہوں نے گروپ میں رہ کر اپنی صلاحیت کا اچھا مظاہرہ کرتے رہے۔محترم خان صاحب نے گریسی عوام کے لئے ایک انگلش میڈیم اسکول کو بھی اپنے ہاتھوں میں لیا جسکو محترم بچہ صاحب ''سوپور'' نے قائم کیا تھا ان کی دلچسپی کی وجہ سے اسکول کو معیاری سمجھا جاتا ہے۔اور اس اسکول سے پڑھے طلباء نے ہر Competition میں

اچھی Position لی اور وادی کے اعلیٰ پرائیویٹ اسکولوں میں اپنا لوہا منوایا۔ محترم خان صاحب خود اعتماد کے ساتھ ساتھ ایک ملنسار، فیاض اور صاف گو اور دور اندیش شخصیت کے مالک بھی ہیں۔ محترم خان صاحب وادی گریس میں لوپیڈ کے صدر رہے انہوں نے ملازموں کے نت نئے مسائل کو حل کرنے میں اچھی ترجمانی کی۔ دوران صدارت بحیثیت صدر انہوں نے ملازموں کے حقوق کی فریاد اُسوقت کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ، ایس ایس بلوریا پرنسپل سیکرٹری ج ے اینڈ کے اور کمشنر سیکرٹری منظور احمد بٹ صاحب، محترم شیخ حسین صاحب، ڈی، سی تک پہنچایا۔ مولف نے چار سال قبل اس کتاب کو مرتب کرنا چاہا مگر بدقسمتی سے ان کے بڑے صاحب زادے کا ایک سڑک حادثہ ہوا جسکی وجہ سے مولف کو کئی ماہ ہسپتالوں کے چکر لگانے پڑے مولف کو ذھنی اور مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حالات اور خیالات ہی بدل گئے جسکی وجہ سے کتاب کا کام التوا میں پڑھا۔ مگر دوستوں اور احباب کے اصرار پر خان صاحب نے دوبارہ کتاب کا کام ہاتھ میں لیا۔

اب کتاب کا ایک حصہ مکمل ہو چکا ہے انشاء اللہ دوسرا حصہ عنقریب آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔

یہ کتاب وادی گریس کے نام پر پہلی کتاب ہے اس سے ہمارے ادیبوں کا ذکر گریس کی طرف مرکوز ہوگا شاید وہ اس عنوان پر اچھے کام کر سکیں گے۔ انہوں نے ایک پہل کی اس سے واقعی خان صاحب مبارکبادی کے مستحق ہیں۔

انشاء اللہ یہ مجموعہ مخلوق خدا کے حق میں نافع اور حق تعالیٰ شانہ کی بارگاہ میں مقبول و برورثات ہو وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ریاست جموں وکشمیر کی گرمائی راجدھانی سری نگر سے لگ بھگ ۶۰ کلو میٹر شمال کی جانب ایک مشہور قصبہ بانڈی پورہ لگ بھگ سولویں صدی سے چین اور وسط ایشا سے آنے والے قافلوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ اور وسط ایشا اور ہندستانی سلطنتوں سے آنے جانے والے قافلوں کے لئے ایک مشہور پڑاو کی حثیت سے مشہور رہا ہے۔ اپنی اس مشہوری کو زمانے کے اُتار چڑھاؤ کے باوجود اب تک قائم اور دائم رکھے ہوئے ہے۔ اس علاقے کو مشہور جھیل وُلر کی وجہ سے بھی کافی اہمیت رہی ہے۔ اس قصبے کے عین شمال میں کوئی پچاسی کلومیٹر کے فاصلے پر ایک پہاڑی بستی ہے جس کا نام علاقہ گریز ہے۔

بانڈی پورہ سے کوئی تین چار کلومیٹر دور شمال میں سنزوانی پل پار کرتے ہی پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس پہاڑی سلسلے کے عین دامن میں ایک گاؤں مانتری گام ہے اس کے بیچ سے گذر کر پہلے زمانے میں ایک تنگ دشوار گذار راستہ سری بل سے گذر کر تراگ بل پہنچتا تھا۔ یہاں ایک خوبصورت سرسبز چراگاہ نہایت حسین اور دلکش جہاں ایک ریسٹ ہاوس بھی ہے۔ پانچ چھ گھنٹوں کے پیدل سفر کے بعد مسافروں کے لئے پیدل پڑاؤ ہوا کرتا تھا۔ یہاں پر بانڈی پورہ کے گوالے اپنی گائیں لیکر گرما کے تین چار مہینے مسافروں کو دودھ مہیا کرتے تھے۔ موسم گرما میں یہاں پر ایک رونق سی لگتی تھی۔ گاڑی کا راستہ لگتے ہی اس میں کمی آ گئی۔ لیکن اپنے زمانے میں تراگ بل کی اپنی اہمیت تھی۔

کہتے ہیں کہ قبائل حملے کے دوران ۱۹۴۸ء اپریل میں مرزا احسن خان نامی کسی کمانڈر کے تحت قبائل تراگ بل تک آئے تھے۔ اور چونکہ بانڈی پورہ میں ہندوستان کی فوج پہلے ہی پہنچ چکی تھی اس لئے وہ یہاں سے پھر واپس مقبوضہ کشمیر کی طرف لوٹ گئے۔ تراگ بل سطح سمندر سے ۹۰۰۰ فٹ بلندی پر واقع ہے اور گلمرگ سے کچھ کم حسین نہیں ہے۔

یہاں سے آگے رازدان کا پہاڑ ہے ۱۲۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس پہاڑ پر پہنچنے سے قبل ایک فقیر درویش کی قبر راستے کے داہنے طرف واقع ہے جو گریز سے بانڈی پورہ سفر کے دوران یہاں پر وفات ہو چکے ہیں۔ اور موضع بنہ کوٹ کے ایک نامور شخص نے بنہ کوٹ سے کچھ آدمی روانہ کر کے تراگ بل اور رازدان کے درمیان ایک خوبصورت جگہ پر اُن کو دفن کروایا ہے۔

اس بزرگ کے متعلق میں نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں کنزلون کے ایک معزز شخص خواجہ دلبر لون سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا ”یہ ایک فقیر ہوا کرتے تھے۔ جو اکثر مختصر پوشاک میں ہوتے تھے۔ لوگوں سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ اکثر گوشت گوشت پکارتے تھے۔ اور اس دور میں علاقہ گریز میں مویشیوں میں ایک بیماری پھیلی اور اکثر مویشی ہلاک ہوئے۔ یہ فقیر گریز سے آئے اور سردیوں میں بانڈی پورہ کی طرف چل دئے۔ اور سفر کے دوران رازدان پہاڑ کو پار کر کے اُن کی روح قبض ہوی اور نہ معلوم کتنے دن اس جگہ پر رہے۔ اتنے میں بنہ کوٹ جو تراگ بل کے نیچے بائیں طرف واقع ہے کے ایک امیر ترین شخص دلاور ملک نے خواب دیکھا۔ خواب میں اس کو اس فقیر کی وفات اور اُن کی تدفین کے بارے میں بتایا گیا۔ اپنے وقت کے بااثر شخصیت تھے۔ اور خدا ترس بھی تھے۔

اس لئے اشارہ پاتے ہی انہوں نے چند نوجوان پہاڑ پر روانہ کئے اور مرحوم کی تدفین کی ہدایت دی۔ جب یہ نوجوان پہاڑ پر پہنچ گئے تو انہوں نے لاش کو پایا فوراً تدفین کا انتظام کیا۔ اب چونکہ میت کا جنازہ پڑھنا تھا اس لئے یہ لوگ خیال کرنے لگے کہ اب جنازہ کون پڑھائے گا۔ یہ اس خیال میں تھے کہ اچانک اُن کی نظر رازدان سے اترتے ہوئے ایک قافلے پر پڑی اسلیئے اُن کا انتظار کیا گیا۔ قافلہ جب نزدیک پہنچا تو یہ ایک ایسی جماعت تھی جس میں ایک بزرگ بھی شامل تھا اور اس نے میت کی نماز جنازہ پڑھائی اور قافلہ رخصت ہوا۔ جب یہ لوگ تدفین سے فراغت پا کر واپس نکلے تو راستے میں اُن کو اس قافلے کے بارے میں کوئی آثار نہیں ملے۔ اور انہوں نے تراگ بل میں بھی اس قافلے کا پتہ کیا مگر کچھ نہیں ملا" اسلیئے اُن کے مطابق یہ کوئی غیبی سبب تھا۔ واللہ عالم۔ یہ کہانی خواجہ دلبر لون صاحب نے مجھے بتائی ہے۔ تب سے یہ جگہ فقیر صاحب کی قبر کے نام سے مشہور ہے۔ اور ہر آنے جانے والا مسافر یہاں پر فاتحہ پڑھنے کے لئے ضرور رُک جاتا ہے۔ یہ جگہ کافی بلندی پر واقع ہے۔ اور نہایت خوبصورت، سرسبز اور شاداب ہے۔ گرمیوں میں یہاں پر وادی سے آئے ہوئے مال مویشی کے ریوڑ دُور دُور تک نظر آتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں تقریباً ہر گاڑی کچھ لمحے یہاں ضرور رُکتی ہے۔

اس کے فوراً بعد رازدان کا پہاڑ ہے۔ یہاں سے آپ کو ہمالیائی سلسلے کے کافی پہاڑ سر اٹھائے نظر آئیں گے۔ یہاں سے آپ ہرمکھ اور ننگا پربت کی برف پوش چوٹیوں کا نظارہ کرسکتے ہیں۔ یہ جگہ موسم بہار اور گرمیوں میں جتنی دلکش اور خوبصورت لگتی ہے۔ اس سے کئی زیادہ موسم سرما میں خوفناک اور جان لیوا

بھی ہوتی ہے۔ راز دان سطح سمندر سے تقریباً ۱۲۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اور سال کے تقریباً سات مہینے برف پوش رہتی ہے۔ اور وادی گریز کو سال کے تقریباً سات مہینے تک وادی سے بالکل کاٹ کر رکھدیتی ہے۔ پہلے زمانے میں لوگ پیدل ہی اسے عبور کر کے بانڈی پورہ آتے تھے۔ مگر سال ۱۹۷۱ء میں بھارت کی خاتون وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے گریز وادی کا دورہ کرلیا اور موقع پر ہی بانڈی پورہ اور گریز کے درمیان ایک سڑک گاڑیوں کی آمدورفت کے لئے بنانے کے احکامات دئے۔ اور بیکن نے اس راستے کو بنانے کا کام سال ۱۹۷۲ء میں شروع کیا جو آہستہ آہستہ بنتا گیا۔ اور سال ۱۹۸۰ء میں بانڈی پورہ اور گریز کے درمیان باضابطہ گاڑیوں کی آمدرفت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس سڑک کے بننے سے پہلے ۱۹۴۸ء میں ایک جیپ روڑ بنایا گیا تھا جس پر صرف فوجی جیپ وغیرہ چلتے تھے۔

راز دان پہاڑ سے اتر کر نیچے پہاڑی دروں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جسے ''گرگ بل'' کہتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں یہاں پر کوئی گاؤں وغیرہ نہیں تھا۔ البتہ پیدل چلنے والوں کے لئے یہاں پر پڑاو تھا اور یہاں پر ایک ریسٹ ہاؤس ہوا کرتا تھا جو ۱۹۸۰ء میں نذر آتش ہوا۔ وسط ایشا اور شمالی علاقہ جات سے آنے والے قافلے یہاں پر دوران سفر پڑاو ڈال دیتے تھے اور اس پڑاؤ کے سلسلے میں آہستہ آہستہ کچھ گھر آباد ہوئے۔ جن کا تعلق تقریباً موضع وانپورہ سے ہے یہاں سے چند میل آگے چل کر ہمیں ایک اور گاؤں سے گذرنا ہے اس کا نام ''کنزلون'' ہے۔ پہلے زمانے میں یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ جہاں چند گھر ہی تھے۔ مگر آج یہ ایک اچھا خاصا گاؤں ہے۔ سال ۱۹۹۲ء کے تباہ کن سیلاب کی

زد میں آ کر یہ گاؤں اپنی اصلی حیثیت کھو چکا۔ اور یہاں کی اکثر آبادی یہاں سے ہجرت کر گئی اور یہاں سے بائیں جانب ایک راستہ جاتا ہے۔ یہ راستہ وادی نیلم کی طرف جاتا ہے۔ جو ۱۹۴۷ء سے قبل وادی نیلم سے ہوتا ہوا مظفر آباد جاتا تھا۔ اس راستے میں ایک خوبصورت دلکش میدان ہے۔ گھنے جنگل کے دامن میں کنزلون سے ہجرت کئے ہوئے لوگوں نے ایک نئے گاؤں کو آباد کیا ہے۔ جسے نئی بستی کنزلون سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس نئے گاؤں سے چند ہی قدم کے فاصلے پر مشہور جگہ ایزمرگ ہے۔ جس کی خوبصورتی اور حسن اپنی مثال آپ ہے۔ ایزمرگ سے آگے بھکتور، تارہ بل اور کچھ چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد ہیں۔ جو تعداد میں پانچ چھ ہیں۔ ''دریائے کشن گنگا'' کے بائیں کنارے یہ گاؤں آباد ہیں۔ یہاں پر آباد لوگ کشمیری بولتے ہیں۔ اور یہ لوگ قدیم زمانے میں وادی لولاب سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ تارہ بل جو کہ تحصیل گریز کا آخری گاؤں ہے اس کے آگے کنٹرول لائین ہے اور مشہور ہے کہ اس گاؤں سے کچھ آگے جا کر شاردا یونیورسٹی ہوا کرتی تھی۔ یہاں سے ہم واپس کنزلون لوٹیں گے۔ موضع کنزلون میں ایک سرکاری ریسٹ ہاؤس بھی ہے جو دریائے کشن گنگا کے کنارے واقع ہے۔ یہاں پر چند دکانیں بھی ہیں۔

دریائے کشن گنگا کو پار کر کے بائیں جانب یہ راستہ اب سیدھا گریز کی طرف جاتا ہے۔ پل پار کر کے چند منٹوں کے سفر کے بعد ایک گاؤں ہے اسے نائیل گاؤں کہتے ہیں۔ یہ لوگ کشمیری زبان بولتے ہیں۔ اور بانڈی پورہ کے گاؤں خاپار سے ہجرت کر کے کچھ لوگ یہاں آباد ہوئے تھے۔ اور اب ایک اچھا گاؤں آباد ہے۔

یہاں سے آگے چل کر واپس دریا پار کر کے ہم پہاڑی سلسلے سے گذرتے ہیں۔ تو ہمارے سامنے ایک دیوہیکال پہاڑ تکونی شکل میں پوری آن بان سے کھڑا نظر آتا ہے۔ یہ وہ چٹان ہے جو کبھی پیدل چلنے والوں کے لئے کسی طوفان سے کم نہ تھی۔ ایک انگریز سیاح نے اپنے ایک سفر نامے میں اس چٹان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"We must have missed the way, for there was a better path over the top of the cliffs, by which our coolies went, but in the attempt to find a short cut near the river we found ourselves crawling along most precarious ledges 30 feet above the deep swift Kishenganga. It was my first introduction to a difficult pari................ (Dr. Arther Nieve in thirty years in Kashmir)

یہاں سے اس وادی کا آغاز ہوتا ہے۔ جسے وادی گریز کہتے ہیں۔ یہ وادی تقریباً گیارہ میل لمبی اور ایک میل چوڑی ہے۔ اس کے دونوں اطراف پہاڑ ہیں اور بیچ میں دریائے کشن گنگا بہہ رہا ہے۔ دریائے کشن گنگا تلیل وادی کے بیچوں بیچ سے گذر کر موضع اچھورہ کے قریب ایک اور دریا جو برزل سے نکلتا ہے۔ کشن گنگا سے بغل گیر ہوتا ہوا اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے۔ کشن گنگا سرحد کے اُس پار دریائے نیلم سے موسوم ہے۔ اور اس کے نام سے وہاں پر ایک وادی۔ ''وادی نیلم'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دریا اس وادی کے بیچوں بیچ سے گذر کر مضفر آباد

کے قریب دریائے جہلم میں مل جاتا ہے۔

وادی گریز جغرافیائی حساب سے تین علاقوں پر مشتمل ہے۔ بھگتور، گریز اور تلیل اور مجموعی طور پر پچاس گاوں پر مشتمل ہے۔ یہ دس گاوُں بہت قدیم ہیں ان میں کوئی نیا اضافہ نہیں ہوا۔ یہ گاوُں کچھ اس طرح ہیں۔

نمبر شمار	گاوُں کا نام
۱۔	بڈون
۲۔	کھوپری حاجن
۳۔	وانپورہ
۴۔	کھنڈیال
۵۔	فقیر پورہ
۶۔	داور
۷۔	مستن
۸۔	مرکوٹ
۹۔	اچھورہ
۱۰۔	چورون

تاریخ کی کتابوں اور بزرگوں سے معلوم ہوا ہے کہ گُرگ بل کے بعد بڈون مسافروں کے لئے دوسرا اہم پڑاو تھا۔ یہاں پر ایک ریسٹ ہاوس تھا جس میں چند کمرے اور ایک الگ کچن بھی تھا جس میں کھانے پینے کے برتن وغیرہ بھی موجود تھے۔ شاید یہ ڈوگرہ حکمرانوں کے وقت سے موجود تھا۔ انگریز سیاح اکثر یہاں پر چند دن قیام پذیر ہوتے تھے۔ سال ۱۹۷۲ء اگست میں اس وقت کے

منصوبہ بندی کے کمشنر جناب نور محمد جب ریاست کے تمام سربراہان محکمہ جات کو لیکر گریز آئے تھے تو اسی ڈاک بنگلہ میں دو روز قیام کیا تھا۔ اور اس روز مستن اور مرکوٹ کے درمیان دریائے کشن گنگا کے کنارے ایک ڈاک بنگلے کی تعمیر کے احکامات صادر کئے اور اب یہ گریز کا دوسرا ڈاک بنگلہ ہے جو سال ۱۹۷۵ء میں مکمل ہو گیا اور اُس وقت کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اس کا افتتاح بھی کیا اور رات کو یہی قیام کیا۔ جناب نور محمد نے اس روز ہی بڈون کے ڈاک بنگلے میں تمام سربراہان محکمہ جات سے تبادلہ خیال کے دوران "for Gurez Development Plan" کا خاکہ تیار کیا جو بعد میں ایک کتابی شکل میں چھپ کر تمام محکمہ جات کے سربراہان کے پاس گیا۔ اس میں ہر محکمہ کے لئے ایک تعمیری پروگرام مرتب کیا گیا تھا۔

کہتے ہیں کہ جب بھی کوئی انگریز حاکم یا ڈوگرہ شاہی کا کوئی عہدیدار یہاں وارد ہوتا تھا تو بستی سے اُن کے لئے دودھ وغیرہ کا انتظام گریز میں موجود عہدیدار کے زریعے قبل از آمد ہی کرایا جاتا تھا۔ گریز وادی کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں صرف انگریز سیاحوں کے سفر ناموں میں ہی زیادہ ملتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس خوبصورت وادی کا ذکر تاریخ کی اردو کتابوں میں جو کہ کشمیری مورخوں نے لکھی ہیں نہیں ملتا ہے۔ جو بھی انگریز سیاح اس راستے سے گذرا ہے اُس نے اپنے سفر نامے میں گریز اور اس کی خوبصورتی، اِس کے باشندوں کے بارے میں کچھ کچھ تذکرہ ضرور کیا ہے۔

ہماری یہ وادی سطح سمندر سے تقریباً ۷۵۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ وادی ایک تنگ درے میں واقع ہے چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھری ہوئی

ہے ان پہاڑوں میں ایک مشہور پہاڑ ہے جسے ''حبہ خاتون'' پہاڑ کے نام سے جانا جا تا ہے اس پہاڑ کے دامن میں ایک نہایت ہی صاف و شفاف لذیز اور دودھیہ رنگ کا چشمہ پہاڑ کو چیرتا ہوا بہتا ہے۔ حبہ خاتون پہاڑ مشہور شاعرہ حبہ خاتون کے نام سے موصوف ہے اور اس کے دامن میں بائیں جانب ایک اور درہ جسے ''چک نالہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے آگے تلیل وادی تک پھیلا ہوا۔ مشہور ہے کہ حبہ خاتون اس پہاڑ کے دامن میں کچھ روز قیام کرچکی تھی اور یوسف شاہ چک کے نام سے چک نالہ موصوف ہے۔ اس درے میں شکار خصوصاً "Musk Deer" کافی موجود ہیں چونکہ یوسف شاہ چک شکار کا شوقین رہا ہے اس لئے کچھ کچھ مناسبت پیدا ہوتی ہے گو کہ تاریخ میں ایسا کچھ نہیں ملتا ہے۔ یہ وادی جتنی دلکش اور حسین ہے اتنی ہی دشواریوں اور پریشانیوں کا مسکن بھی ہے۔

بڈون ماضی میں نہایت خوبصورت گاؤں تھا۔ ریسٹ ہاوس کے قریب درئے کشن گنگا کے کنارے سفیدہ کا باغ (فرس باغ) نہ صرف بڈون گاؤں بلکہ پوری گریز وادی کے حسن کو دوبالہ کردیتا تھا۔ سرکار اور عوام کی عدم توجہی سے اب یہ درخت ختم ہوچکے ہیں۔

وجہ تسمیہ۔

ہر چیز اور ہر جگہ کا ایک نام ہوتا ہے۔ اور اس تسمیہ کا کچھ پس منظر بھی ہوتا ہے۔ اس وادی کے نام کے بارے میں غور کریں۔ تو اس کے تین الگ الگ نام ہیں۔

۱۔ گورئے

۲۔ گُریس

۳- گرُیز

۱- گورے۔ یہ اس وادی کا اصلی اور اپنی زبان شینا کا نام ہے۔ یہ اصل میں "گوہرئے"۔ یہ دو الفاظ کا مرکب ہے۔ "گو"۔ مویشی۔ "ہرئے" درختوں کی سوکھی ٹہنیوں اور چھوٹی لکڑیوں سے باندھا ہوا ایک حاطہ جس کے اندر مال مویشی باندھے جاتے ہیں۔ موسم بہار اور گرما میں۔ ان دو الفاظ کو ملاکر گوہرئے بن جاتا ہے۔ یعنی حاطہ جس میں مال مویشی محفوظ طریقے سے رکھا جاتا ہے۔ یہ اکثر بہکوں میں رہنے والے لوگ اپنے مال مویشی راتوں کو ان حاطوں کے اندر رکھتے ہیں تاکہ راتوں کو جنگلی درندے کوئی نقصان نہ کریں۔ چونکہ گریز وادی ایک مرغزار وسیع چراگاہوں کا مسکن ہے۔ بستی لگنے سے پہلے تو یہ اور بھی زیادہ سرسبز اور شاداب وادی ہوتی۔ اور مال مویشی پالنے کے لئے زیادہ موزوں ہوتی۔ اور شاید کچھ لوگ اپنے مال مویشی لیکر موسم گرما میں یہاں رہ رہے ہونگے اور اس نسبت سے اس کا نام گوہرے رہ گیا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لوگ اپنے مال مویشی کے ساتھ یہاں رہتے ہونگے اور اچانک موسم کی تبدیلی نے ان کو یہاں رکنے پر مجبور کیا ہو۔ اور اس طرح آہستہ آہستہ مزید لوگ بھی یہاں آئے ہوں اور پھر ایک بستی کی بنیاد پڑی ہو۔ اور لوگوں کا پیشہ مال مویشی پالنا ہی رہا ہو۔ کیونکہ گریزیوں کو شینا میں گوراچھے کہا جاتا ہے۔ اور یہ نام بھی اسی نسبت سے لگا ہو۔ "واللہ عالم"۔

- گرُیس۔ اگر گ کے اوپر (ُ) ڈالکر پڑھا جائے تو گرُیس بن جاتا ہے۔ جس کا اردو زبان میں کوئی خاص مطلب اور معنی نہیں ہے۔ اس لفظ کو انگریزی ڈکشنری میں بھی تلاشا مگر کہی نہیں ملا۔ اب اگر اس لفظ کو پیش ڈالنے کے بغیر

This logic can help — Dwar — (door) → D can be with time turned into 'Dawar'

پڑھا جائے مثلاً گریس۔ تو یہ انگریزی لفظ Grace بن جاتا ہے۔ تو انگریزی زبان میں Grace کا مطلب ہوتا ہے حسن و جمال شاید کسی انگریز مسافر یا سیاح نے جون جولائی کے خوشگوار موسم میں دوران سفر اس علاقے کے حسن و جمال اور خوبصوتی۔ شادابی کو دیکھ کر Grace کا لفظ استعمال کیا ہو۔ جو آہستہ آہستہ گریس بن گیا۔ انگریزوں نے اپنے سفرناموں Gurais ضرور لکھا ہے۔ جیسے کہ ڈاکٹر آرتقر نیو نے اپنے سفرنامے in Kashmir Thirty years میں لکھا ہے۔

At Gurais, although the kashmiri language is spoken. The people are Dards by race..."

۳۔ گریز۔ گریز کا مطلب ہے اعراز کرنا۔ مثلاً کسی کام سے اعراز کرنا۔ کسی جگہ جانے سے اعراز کرنا۔ To avoid اس نام کا بھی اس وادی کے ساتھ گہرا تعلق ہوسکتا ہے۔ جب اس وادی میں انسانی بستی کی بنیاد پڑی ہوگی۔ اس وقت یہ وادی بالکل ویران دشوار گذار اور پریشانیوں سے بھری ہوئی ہوتی ۔ یہاں پر عبور و مرور کے راستے نہیں ہوتے۔ انسانی بستی کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ تو اس وقت یہاں آنے جانے سے لگ بھگ ہر شخص اعراز کرتا ہوتا۔ اور یہ بھی اس کی وجہ تسمیہ ہوسکتی ہے۔

زبان۔ یہاں کی بیشتر آبادی شینا زبان بولتی ہے۔ اور صرف چند ایک گاؤں میں کشمیری زبان بولی جاتی ہے۔ شینا بولنے والے لوگ اکثر شمالی علاقہ جات سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے۔ جو اکثر چلاس، گلگت، دریل، وغیرہ سے یہاں آئے ہیں۔ اور مختلف گاؤں میں آباد ہوئے ہیں۔ اور کشمیری بولنے

والے دو ایک گاؤں وادی کشمیر سے یہاں وارد ہوئے ہیں۔ جیسے داور، فقیر پورہ، نائیل اور بھگتور۔

فقیر پورہ کے لوگ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اس گاؤں کا تعلق براہ راست اُن بزرگ سادات سے ہے جن کی تشریف آوری سے گریز میں اسلام کی جڑیں مضبوط اور استوار رہی ہیں۔ اور یہ اُن حضرات کی ہی مہربانی ہے کہ اس وادی کی پوری آبادی سُنی ہے۔ اور یہاں کوئی دوسرا فرقہ نہیں ہے۔ اس بارے میں میں نے مولوی فتح محمد شاہ صاحب سے دریافت کیا جو اس گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ اور حضرت بابا درویشؒ کے آستانے سے اُن کے بزرگوں کا گہرا تعلق رہا ہے۔ تو اپنے آبا واجداد کے بارے میں مولوی صاحب نے فرمایا۔ "گریز میں سادات حضرات کا وُرود مسعود تقریباً پندرھویں صدی عیسوی کے ابتدا میں ہی ہوا ہوگا۔ جیسے کہ بیربل کاچرو لکھتے ہیں۔ کہ ۱۵۲۰ء میں۔ عبداللہ خان۔ حیدر خان پٹھانوں کے دور کے راجاؤں میں سے تھے۔ اور عبداللہ خان کے نواسے اپنے مرشد کے فرمان سے بابا درویش صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بابا درویش صاحبؒ کی خدمت میں لگے رہے۔ اور بابا درویش کے آستانے کے قریب ہی اس گاؤں کی بنیاد پڑی اور انہیں کی اولاد یہاں آباد ہوئی اور خان سے شاہ میں تبدیل ہوئے"۔ اس طرح یہ واضح ہوتا ہے۔ کہ حضرت بابا درویش صاحبؒ اس سے پہلے ہی یہاں لوگوں کی روحانی تربیت کے لئے تشریف لا چکے تھے۔ حضرات سادات کی آمد سے قبل یہاں قلیل تعداد آبادی مسلم ہوگی جس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے۔ کہ لوگ علاقہ دردستان سے یہاں آچکے تھے۔ اور دردستان میں وادی کشمیر سے پہلے اسلام پھیل چکا تھا۔ چونکہ قدیم زمانے میں میدانی اور زرخیز مقامات پر ہی لوگ آباد تھے۔ اور تمام (شینا) بولنے والے لوگ

دردستان سے ہی ہجرت کر کے یہاں مختلف گاؤں میں چورون سے لیکر بڈون تک اور تلیل میں برنائے سے لیکر عبدلن تک آباد ہوئے۔ اور یہ عارضی بستیاں آہستہ آہستہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مستقل ہوگیں۔ تلیل میں ایک گاؤں ''منیرؤ'' کے لوگ علاقہ لار سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ اور یہ میر ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ انگریز سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں کشمیر میں شخصی حکومت کے دور میں بے گار ''Forced Labour'' کا ذکر کیا ہے۔ اور اس بے گار سے بچنے کے لئے چند لوگ وادی کشمیر سے ہجرت کر کے پہاڑی علاقوں کی طرف نکل گئے اور اُن میں سے چند موضع داور، اور کچھ بگتور میں آباد ہو گئے۔

مولوی فتح محمد شاہ صاحب کے مطابق پندرھویں صدی میں کم قلیل آبادی بس چکی ہوگی کیونکہ حضرات سادات اس وقت یہاں وارد ہو چکے تھے۔ یا پھر اُن کا گذر دردستان سے ہوا ہوگا اور چند لوگ اُن کے ہمراہ یہاں آ کر آباد ہوئے ہونگے۔ چونکہ یہ جگہ واقعی اس وقت خاموش اور سنسان ہوتی اور اللہ کی عبادت کے لئے نہایت موزوں رہی ہوگی۔ اور اُن کی وجہ سے ہی اس بستی کا وجود بھی رہا ہوگا۔ جس کا اندازہ مجھے اپنے گاؤں میں ہی ایک خاندان کے تاریخی پس منظر سے ہوتا ہے۔

موضع اچھورہ جو کاتب الحروف کا گاؤں ہے۔ یہاں پر ایک خاندان ہے جن کے بزرگ کافی دیندار گذرے ہیں۔ اُن کا جد جس کا نام ''امر اللہ'' تھا چلدس سے یہاں آیا تھا وہ زبردست روحانی بزرگ تھا۔ دن رات اللہ کی عبادت کرتا تھا۔ اور اُن کا ایک بیٹا تھا جس کا نام عزیز اللہ تھا۔ وہ بھی کافی بزرگ رہا ہے۔ اور اُن کے تین بیٹے تھے۔ جن میں سے دو نہایت ہی دیندار اور باشریعت تھے اور ان دونوں بزرگوں کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ یہ ساٹھ کی دہائی کے اوائل تک بقید حیات تھے۔ بڑے کا

نام فقیر اللہ تھا اور چھوٹے کا نام رحمت اللہ تھا۔ اللہ تعالےٰ نے اُن کو اپنی رحمتوں سے اتنا نوازا تھا کہ وہ مستجاب لدُعا تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعا سنتا تھا۔ وہ فقیرانہ زندگی گذارتے تھے۔ دن رات اللہ کی عبادت میں گذراتے تھے۔ میں نے علاقہ بھر سے لوگوں کو اُن کے پاس آتے جاتے دیکھا ہے۔ حضرت بابا درویش کے ساتھ اُن کی زبردست عقیدت تھی۔ میں نے اُن کو لاٹھی ٹیک کر بابا درویش اور بابا رزاق صاحب کی قبر شریف پر حاضری کے لئے جاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ آپ یہ پڑھ کر حیران ہونگے کہ رحمت اللہ صاحب جو تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں رحلت کر گئے کبھی گریز وادی سے باہر نہیں گئے تھے۔ گریز میں اس وقت جتنے بھی اچھے لوگ تھے وہ ان دونوں بھائیوں کی نہایت عزت اور احترام کرتے تھے۔ اور اُن سے روحانی فیض حاصل کرتے تھے۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا میں بالکل چھوٹا تھا اور اگست کا مہینہ تھا۔ میرے گاؤں میں وزیر وزارت تشریف لائے تھے اور لوگ آپ کو گھیرے ہوئے تھے۔ سکول بچے آپ کے سامنے prayer پڑھتے تھے۔ اتنے میں فقیر اللہ صاحب وہاں لاٹھی ٹیک کر تشریف لائے۔ چونکہ بزرگ مذکورہ میری والدہ کے دادا تھے اور میں ہر وقت اُن کے قریب رہتا تھا۔ اس لئے مجھے اُن کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہیں۔ جب آپ وہاں تشریف لائے تو وزیر وزارت جن کا نام پنڈت بھارت بھوشن تھا۔ آپ کی بارُعب شخصیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ آپ کے استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ آپ سے مصافحہ کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ اُس بزرگ نے فارسی میں کچھ اشعار پڑھے۔ پنڈت جی نے آپ کو کُرسی پر بٹھایا اور آپ سے بہت ساری باتیں کیں۔ کم سنی کی وجہ سے مجھے وہ شعر یا اُس کے الفاظ یاد نہیں ہیں۔ ورنہ قارئین کی نظر ضرور کرتا۔ اس دور میں دینی ماحول یہاں پر بہت اچھا تھا۔ اور مجھے یقن

Orientals — have written about us. But are they biased? Have they portrayed us in negative light?

ہے یہاں کی آبادی بھی حضرات سادات کی ایماپر ہی بسی ہوگی۔

۱۸۸۸ء میں لکھی ہوئی ایک کتاب Thirty years in Kashmir سے پتہ چلتا ہے کہ گریز کے لوگ بڑے بہادر اور محنت کش تھے۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں آباد تھے۔ یہاں پر تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ لوگ بالکل ان پڑھ تھے۔ حکومت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ظلم اور تشدد تھا۔ بیگار سے لوگ زبردست پریشان تھے۔ گریز جیسے دور دراز پہاڑی علاقے میں بھی لوگ گرمیوں میں پہاڑون میں جاکر اپنے مویشوں کے ساتھ رہتے تھے تاکہ رہ راہ چلنے والے مسافروں کے ظلم اور پریشانیوں سے محفوظ رہ سکیں۔ اس طرح سے جب وہ بستی میں پورے وقت نہیں رہے تو ضروری بات ہے کہ تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں رہی ہوگی۔ اس کا رواج کچھ اب تک بھی ہے۔ موضع کھنڈیال۔ داور اور مرکوٹ کے لوگ اس وقت بھی اپنے قریبی بہیک، کسر، دِسن اور پاتکون میں تین مہینوں کے لئے اپنے مویشوں کے ساتھ گھر کے ایک دو لوگوں کو بھجد یتے ہیں۔ باقی گاؤں سے اب نہیں جاتے ہیں۔

۱۹۱۰ء کے آس پاس تک بھی گریز میں سرکاری سکولوں کا کہیں کوئی نام ونشان نہیں رہاہے۔ اور نہ کوئی کوشش ہوئی ہے۔ چونکہ ڈوگرہ حکومت میں گریز میں کوئی باضابطہ سرکاری آفیسر بھی موجود نہیں ہوتا تھا۔ کہتے ہیں کہ چند پولیس کانسٹیبل موضع وادر میں ہوا کرتے تھے۔ پوری آبادی ان سے خوفزدہ رہتی تھی۔ لوگوں کو اپنے معمولی کام کے لئے ہندواڑہ (اُترماچھی پورہ) نیابت میں رجوع کرنا ہوتا تھا۔ اسلئے لوگ اکثر اپنے معاملات یہاں پر ہی نبھانے میں اکتفا کرتے تھے۔ اور اکثر ظلم اور مشکلات کو برداشت کرتے تھے۔ اور اس کو اپنا مقدر سمجھ لیا کرتے تھے۔

میں نے ماسٹر عبدلکریم ڈار صاحب سے جو پرانے تعلیم یافتہ طبقے میں سب

سے معمر ہیں دریافت کیا۔ تو انہوں نے مجھے اپنے بچپن کے زمانے میں گریز میں تعلیم اور تعلیمی ماحول کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں۔ آپ نے کہا ''گریز'' میں ہمارے زمانے میں تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ کچھ لوگ تھے جو تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ جن میں اچھورہ کے نورہ خان قابل زکر ہیں۔ اور وہ آپ کے دادا بھی ہیں''۔ اُن کے بارے میں آپ کو مجھ سے زیادہ معلومات ہونگی۔ اور دوسرے داور میں احمد میر ہوا کرتے تھے۔ یہ دو لوگ تھے جو لوگوں کے خطوط پڑھتے تھے یا اُن کا جوب لکھتے تھے۔''

نورہ محمد خان۔ آپ موضع اچھورہ کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد دردستان کے علاقہ دریل سے ہجرت کر کے آئے ہیں جہاں تک میرے بزرگوں کی معلومات کا تعلق ہے۔ نورہ خان بچپن میں سری نگر میں رہے۔ اور وہاں سے آپ گلگت میں کچھ عرصہ رہے۔ اسی طرح اپنے سفر کے دوران آپ نے اردو، فارسی اور کشمیری سیکھی تھی۔ سری نگر کے ساتھ آپ کا گہرا تعلق تھا اور ہمیں یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ آپ وہاں کہاں رہتے تھے۔ مگر آپ کے ادبی زوق اور کتب بینی کے شوق سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کسی اچھے خاصے ادبی ماحول میں رہے ہونگے۔ آپ اردو اور فارسی اچھی طرح پڑھتے اور لکھتے تھے۔ آپ کی چند تحریریں اب بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔ آپ کے پاس دینی اور ادبی کتابیں کافی تعداد میں موجود تھیں۔ جن میں سے چند ایک میں نے بھی دیکھی تھیں۔ مسدس حالی، سیرۃ لنخمان، قصص انبیا وغیرہ، یہ تین کتابیں وہ جن کو میں نے کھول کے دیکھا تھا باقی تو بند تھیں اور ہمارے بزرگ ہم بچوں کی رسائی سے انہیں دور رکھتے تھے۔

یہ ادبی اثاثہ ۶ جنوری ۱۹۷۲ء کی رات میں ایک ناگہانی آتش زنی میں

نظر آتش ہوا۔ اس حادثہ سے پورا اچھورہ گاؤں جل کر خاک ہوگیا تھا۔ گریز وادی میں ۱۹۳۰ء سے لیکر اپنی وفات سال ۱۹۵۱ء تک آپ باضابطہ اتر پردیش بھارت سے اردو اخبار ''مدینہ'' بزریعہ ڈاک منگایا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ دہیں سے ریحانہ بکڈپو سے ایک دینی رسالہ ''آستانہ'' بھی باقاعدہ منگایا کرتے تھے۔ جو آپ کی وفات کے بعد بھی لگ بھگ ۱۹۶۰ء کی دہائی تک ہمارے گھر میں برابر آتا تھا۔ جو بعد میں ہمارے بزرگوں کی لاپرواہی سے آنا بند ہوگیا۔ آپ کی نظر ملکی سیاست سے باہر عالمی سیات پر بھی تھی چونکہ دوسری جنگ عظیم جاری تھی۔ اسلئے اخبارت کے ذریعے آپ گھر بیٹھے بیٹھے اس زمانے میں بھی بین الاقوامی حالات پر نظر رکھتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم کا زکر آیا ہے تو یہاں پر یہ بات قابل زکر ہے کہ اس جنگ میں برطانوی فوج میں گریز وادی سے بھی دو نوجون شامل تھے۔ جو ملک ہندوستان سے باہر برطانوی فوج کے ساتھ اتحادی افواج میں شامل تھے۔ اُن میں سے ایک میرے گاؤں کے رہنے والے تھے جن کا نام عبدلکریم لون ولد عبدالعزیز لون تھا۔ جو ۱۹۶۰ء کی دہائی میں وفات پاگئے اور ایک حاجی عزیز اللہ آخون ولد رحمت اللہ آخون ساکنہ مرکوٹ حال سنروانی بانڈی پورہ میں مقیم ہیں اور بقید حیات ہیں۔ اور گریز میں اپنی رہائیش کے دوران ایک معروف شخصیت کے مالک تھے۔

گریز کی تمام آبادی ایک خاص قبیلہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے درد قبیلہ کہا جاتا ہے۔ اور اس قبیلہ کی زبان شینا ہے۔ اور اس نسبت سے اس قوم کو دردشن کہا جاتا ہے اور آریائی نسل سے ان کا تعلق ہے۔ یہ قوم ہندوکش سے ہوتی ہوئی تبت میں کافی عرصہ رہنے کے بعد دردستان میں پھیل گئی ہے۔ اس قوم کے بارے میں ایک انگریز ڈاکٹر نے اپنے سفرنامے میں یوں لکھا ہے۔

At Gurais, although the Kashmiri language is spoken, the people are Dards by race,and closely allied to the tribes which occupy the valleys draining into the Indus where it makes its great bend to the south. They appear to have been there from pre-historic times, occupying much the same area for though at times temporarily sub dued by powerful Indian monarchs or by the Kings of Kashmir, yet there is not much land in those wild mountains to tempt the conquerers to disposes any oborigines. It is a moot question whether the Dards did not occupy the western part of Tibet long before the bigning of the christian era and until the Tibeteans pushed them out. They still remain a distint group of tribes, very seldom intermarrying with either the Kashmiris, the Baltis or the Pathan tribes which border them............(Thirty years in Kashmir Page 61)

دوسری جگہ آپ لکھتے ہیں۔

Why isn't it clear?

"To put question in nutshel, one may say that the shin races (i.e. Dards) first occupied the eastern Hindu Kush, gradualy spreading up from India and bringing with them Indian religious thought and custums"......... (Page 84).

اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ درد پہلے یا تو ہندو رہے ہونگے یا پھر بودھ مذہب کے ماننے والے۔ مگر جو رسوم و رواج تقریباً اُسی کی دہائی تک بدستور موجود تھے۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر ہندو رہے ہونگے۔ صدیوں بعد بھی لوگوں میں کچھ ہندوانہ رسوم موجود تھیں مثلاً راتوں کو یا صبح کا زب کے وقت دریاوں میں نذرانہ لیکر جانا چشموں میں راتوں کو چھپ چھپا کر کھانا وغیرہ لے جانا۔ اور وہاں پر موجود خیالی طاقت یا وجود کو خوش کرنے کی ترکیبیں یا پھر اپنے اُس گھر میں جس میں مال مویشی رکھی جاتی تھی اُس میں رات کھانا وغیرہ رکھنا تا کہ مال مویشی کے درمیان رہنے والی غیبی طاقت اس کھانے کو کھا کر یا دیکھ کر خوش ہو جائے اور اُن کے مال وغیرہ کے لئے باعث برکت بنے۔

اسی طرح سفر میں جانے کے لئے دن اور تاریخ کا مقرر کرنا نوزائیدہ بچوں اور زچہ کے سرہانے پر لوہے کی کوئی چیز، یعنی۔ چاقو دھراتی وغیرہ رکھنا تا کہ ان پر بھوت پریت کا اثر نہ ہو۔ حالانکہ یہ سب توہم پرستی اور بدعقیدگی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کی چند مشہور جگہیں اور دریا، چشمے وغیرہ بھی ہندی ناموں سے موسوم ہیں۔ مثلاً وادی گریز کے بیچ سے بہتا ہو خوبصورت دریا ''کشن گنگا'' جسے اُس پار وادی نیلم میں دریائے نیلم کہا جاتا ہے۔ بڈون کا مشہور چشمہ ''پشکر ناگ''، اس

طرح ایک پہاڑی ''نند پتھ'' وغیرہ۔

اللہ تعالےٰ کا کرم ہے کہ آبادی کے گریز منتقلی کے ساتھ ساتھ ہی شاید حضرات سادات کا بھی وُرد ہوا ہے۔ جس سے لوگ شعیت سے متاثر اکثریت والے ماحول سے خالص سُنی عقیدہ کے ساتھ گریز میں وارد ہوئے۔ لگتا ہے کہ حضرت شاہمدان دوران سفر لداخ، شاید لداخ سے اسکردو ہوتے ہوئے دردستان کے بیشتر علاقہ جات میں بھی گئے ہیں اور اپنے ساتھی سادات حضرات کو وہاں تبلیغی کام میں لگایا ہو۔ جن میں بابا درویش صاحب اور بابا رزاق صاحب، حضرت سید معصوم صاحب اور ایک اور حضرت جن کا نام گرامی معلوم نہیں جو بھگتور میں ہیں۔ لوگوں کے ساتھ ہی وارد گریز ہوئے ہوں اور اُن کی موجودگی میں لوگوں کو تبلیغی ماحول میسر آیا ہو جس سے یہاں کی آبادی اللہ کے فضل وکرم سے سُنی عقیدہ مسلمان رہے ہیں اور اب تک انشااللہ مخلص ہیں۔ ان حضرات میں سے ایک سعید معصوم شاہ موضع چورون میں آرام فرما رہے ہیں اور حضرت بابا رزاق اور حضرت بابا درویش موضع فقیر پورہ میں ہیں اور چوتھے صاحب جیسے کہ اُپر زکر ہوا۔ موضع بھگتور میں دفن ہیں۔ ان بزرگوں کا گریز کے لوگوں پر بڑا احسان ہے۔

کہتے ہیں کہ جناب شمس الدین عراقیؒ لداخ کے راستے سے ہوتے ہوئے اسکردو اور شمالی علاقہ جات کا سفر کرتے ہوئے واپسی پر جب گریز میں داخل ہوئے تو وہاں پر پہلے سے موجود حضرت بابا درویش نے اپنی فراست اور روحانی کمال سے بغیر کسی مدٰاخلت یا تبلیغ وغیرہ کے آپ کو براہ راست وادی کشمیر کا رُخ کرنے پر آمادہ کیا اور تھوڑی دوری تک سُنت کے مطابق مہمان کے ہمراہ چل کر رخصت کیا۔ ان سب چیزوں کی تصدیق اس عقیدت اور احترام سے ہوتی ہے جو ہمارے پہلے بزرگوں کو

حضرت بابا درویش صاحب سے رہی ہے۔

الحمد اللہ پوری آبادی سُنی ہے اور حنفی المسلک ہے آباد اجداد کی رسوم ورواج کی تقلید بھی برابر کرتے رہے ہیں۔ چونکہ آبادی پر زیادہ اثر بریلوی مکتب فکر کا رہا ہے۔ اس لئے بدعات کا کافی اثر تھا۔ بدعات کو لوگ دین سمجھ رہے تھے اور بدعت کے خلاف بات کو دین کے خلاف بغاوت سمجھتے تھے۔ یہاں پر بدعات وغیرہ اور دیگر غیر شرعی رسوم کے بارے میں میرا خیال ہے۔ گریز جو کہ ایک پڑاو تھا۔ یہاں چونکہ اس وقت براہ راست لوگوں کے قافلے سری نگر سے بانڈی پورہ، بانڈی پورہ سے گریز اور گریز سے براہ راست شمالی علاقاجات اور وہاں سے شاہراہ ابریشم سے وسط ایشا اور چین جاتے تھے۔ اور اسی طرح سے واپسی پر قافلے آتے تھے اور ہندوستان اور وہاں سے حج کے لئے عرب اور ایران، عراق وغیرہ جاتے تھے۔ اس طرح سے گریز میں یہ لوگ چند روز ضرور قرار کرتے رہے ہونگے۔ اور اس دوران ان مختلف خیال کے لوگوں سے یہاں کے لاعلم اور ان پڑ لوگوں کا میل ملاپ ہوتا رہتا ہوگا اور سادہ لوح لوگ اُن کی دیکھا دیکھی اور سُنی سنائی باتوں پر عمل کرتے رہے ہونگے۔ چونکہ یہاں پر تب تک کوئی باقاعدہ تعلیمی نظام وغیرہ نہیں ہوگا۔ جس سے لوگوں کو خود دین سیکھنے کا شوق اور تلاش رہتی ہوتی۔ اور وہ ہر نئی بات کا اثر لیتے رہے ہونگے۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی تک یہاں پر سری نگر سے چند پیر حضرات باقاعدہ موسم گرما میں آتے تھے وہ لوگوں کو تعویز اور جھاڑ پھونک سے نوازتے تھے۔ لوگوں کو اُن سے زبردست عقیدت تھی۔ جب پیر صاحب گاؤں میں داخل ہوتا تھا۔ تو مُریداُن کے لئے حسب مقدور دعوتوں کا اہتمام کرتے تھے۔ ان پیر حضرات میں ایک پیر صاحب پیر احمد شاہ خاکی کے نام سے مشہور تھا۔ نہایت ہی

خوبصورت وضع قطع کے مالک تھے نہایت ہی بارُعب شخصیت کے مالک تھے۔ جب بھی گریز میں وارد ہوتے تھے۔ تو اپنے ساتھ ایک اچھی خاصی جماعت لئے ہوتے تھے۔ اور جس بھی مُرید کے ہاں براجمان ہوتے تھے وہاں ایک اچھی خاصی محفل کا انقاد ہوا کرتا تھا اور اس محفل میں اکثر گریز وادی کے سرکردہ شخصیات ہی ہوا کرتی تھیں۔ عام لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی تھی۔ آپ کی ایک خاص بات مجھے اب بھی یاد آتی ہے۔ آپ جس بھی گاؤں میں جاتے تھے وہاں لوگوں کو کسی کھیت کھلیاں میں جمع کر کے کچھ وعظ نصیحت بھی کرتے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ اور حضرات بھی آتے تھے جن میں پیر غلام شاہ قادری، پیر محمد یاسین شاہ اور پیر علی شاہ صاحب بھی قابلِ زکر ہیں۔ مگر یہ تینوں حضرات خاموش طبیت تھے۔ اپنے مُریدوں کو نماز وغیرہ پڑھنے کی تاکید کرتے تھے۔ سال بھر عام لوگوں کو اگر کوئی دینی شرعی مسلہ درپیش آتا تو وہ ان حضرات کی آمد پر اُن سے دریافت کرتے تھے اور جو جواب آپ حضرات سے ملتا تھا اس پر عمل ہوا کرتا تھا۔ یہاں پر کوئی باقاعدہ سند یافتہ دینی عالم موجود نہیں تھا۔ اسلئے بدعت، لغویات اور اصل دین میں فرق کرنا عام لوگوں کے لئے مشکل تھا۔ لوگوں کی دینی تربیت کے لئے کوئی سند یافتہ عالم میسر نہ ہونے کی وجہ سے یہاں پر بریلویت کا بھرپور غلبہ رہا ہے۔ اور یہ سلسلہ برابر ۱۹۸۰ء کی دہائی تک چلتا رہا۔ اور ۱۹۸۰ء کے عشرہ میں گریز میں باضابطہ جمعہ نماز شروع ہوئی اور وعظہ اور تبلیغ کا کام اب دینی علما کی زیر نگرانی میں شروع ہوا۔

گریز میں پہلا سند یافتہ دینی عالم۔ گریز کا پہلا نوجوان جو میٹرک پاس کر کے ۱۹۷۰ء میں گریز سے باہر کسی دینی درسگاہ سے علم حاصل کرنے کی نیت سے اپنے گھر سے نکلا۔ حالانکہ اس نے ۱۹۶۶ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ اور اس

وقت میٹرک پاس کرتے ہی کہیں نوکری مل جاتی تھی۔ مگر اس شخص نے نوکری کے بجائے دینی تعلیم حاصل کرنے کو ترجیح دی اس شخص کا اسم شریف فتح محمد شاہ ولد بہادلدین شاہ ہے۔ موضع فقیر پورہ (شاہ پورہ) کا رہنے والا ہے۔ حضرت بابا درویش رحمت اللہ علیہ کے زات گرامی سے نسبت ہونے کی وجہ سے ہی شاید اُن کے والد صاحب نے جو اپنے آبا و اجداد سے لیکر بابا درویشؒ کی خدمت میں رہے ہیں۔ ان کی دینی تڑپ نے اُن کو اپنے بیٹے کو سرکاری ملازم بنا کر اپنے لئے سامان آسائیش بنانے کے بجائے اُن کو اب دینی علم حاصل کرنے کے لئے سری نگر بھیجنے کا فیصلہ کیا ہو۔ تا کہ وہ آیندہ گریز میں دینی خدمات میں جُٹ سکیں۔ اس بارے میں میں نے خود مولوی فتح محمد شاہ صاحب سے جو میرے ایک فاضل دوست بھی ہیں دریافت کیا تو انہوں نے کہا۔

۱۹۶۶ء میں میٹرک پاس کر کے اس تجس میں تھا کہ دینی علم کیسے اور کہاں سے حاصل کروں۔ کیونکہ گھر میں اچھا خاصا دینی ماحول تھا۔ مگر کوئی ایسا آدمی میسر نہ تھا کہ اس بارے میں راہ نمائی کر سکتے آپ نے کہا کہ ۱۹۷۰ء میں آپ سری نگر گئے اور وہاں مدینۃ العلوم حضرتبل سری نگر میں داخلہ لیا۔ اس ادارے کے پرنسپل مولوی عبدلکبیر صاحب نے اُن کی بھرپور رہبری فرمائی اور اس طرح آپ نے بلترتیب مولوی، مولوی عالم، اور مولوی فاضل کشمیر یونیورسٹی سے ۱۹۷۵ء میں پاس کیا۔ اس دوران آپ نے ادیب ماہر، ادیب کامل اور فاضل دینیات کے امتحانات بھی پاس کیئے اور ۱۹۷۶ء میں آپ واپس گریز آئے۔ یہاں آتے ہی آپ نے جمعہ کے بارے میں تگ و دو شروع کی اور اس سلسلے میں ایک کمیٹی بنانے کی فکر میں لگے۔ اور اس سال ماہ ستمبر سے ماہ نومبر تک آپ نے داور میں ایک شریف النفس شخص عبدالغفار شیخ جو ٹانگوں سے معذور تھے اور

پیشے سے ایک مانے ہوئے درزی تھے کے گھر پر باضابطہ چند مجالس کا انعقاد کیا۔ ان مجالس میں میں بھی شریک رہا۔ ان میں آپ لوگوں کو جمعہ کی اہمیت سے روشناس کراتے تھے۔ اور جمعہ نماز قائم کرنے کا معاملہ لوگوں کے سامنے رکھا چونکہ عام لوگوں کو دینی علم نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہر طرف سے اعتراضات اٹھے۔ مگر آپ نے ہمت نہ ہاری برابر لوگوں کو خصوصاً نوجوانوں کو ہم خیال بناتے رہے۔ چونکہ کچھ حضرات بالکل اتفاق نہ کرتے تھے اس لئے معاملہ دارالفتویٰ دیوبند بھجدیا گیا۔ وہاں سے کسی مقامی مفتی صاحب سے معاینہ کرانے کے لئے کہا گیا اور ۶ اگست ۱۹۷۸ء کو مفتی عبدلغنی اظہری صاحب کی موجودگی میں داور میں پہلا جمعہ پڑھایا بدقسمتی سے میں اُس جمعہ نماز میں شریک نہ ہوسکا۔ کیونکہ میں ملازمت کے سلسلے میں وادی گریز سے باہر تھا۔ البتہ یہ سُن کر مسرت اور خوشی ہوئی کہ مفتی عبدالغنی اظہری نے گریز میں جمعہ قائم کیا جو برسو سے ہماری چاہت تھی۔

اس دوران جمعہ نماز باضابطہ طور داور میں شروع ہوچکی تھی مگر کچھ بزرگ حضرات کو اب بھی اعتراز تھا۔ اس دوران خوش قسمتی سے موضع کھنڈیال کا ایک اور نواجون میٹرک پاس کر کے دینی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے دیوبند میں موجود تھا ان کا نام غلام رسول ساموں ہے۔ آپ کے والد کا نام عبدلجبار ساموں ہے۔ آپ میٹرک پاس کرنے کے بعد ۱۹۷۳ء میں دیوبند اترپردیش تشریف لے گئے اور سال ۱۹۸۲ء میں مفتی کی سند لیکر واپس گریز تشریف لائے۔ آپ کی تعلیم کے دوران گریز میں چونکہ جمعہ قائم ہوچکا تھا اور چند بزرگ اس پر قائل نہیں ہوتے تھے اور جمعہ نہیں پڑھتے تھے۔ ان میں مولوی محمد انور ساموں صاحب قابل زکر ہیں۔ اس دوران مولوی محمد خلیل لون صاحب ایک بزرگ جو تقسیم ملک کے دوران پاکستان چلے گئے

تھے پاس پورٹ پر اپنے بھائیوں سے ملنے وانپورہ آئے تھے۔ اتفاقاً مولوی صاحب بہت بڑے عالم دین اور مبلغ تھے جب آپ سے جمعہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فوراً دیوبند سے رجوع کیا اور یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ متذکرہ بالا مولوی غلام رسول صاحب طالبعلم دیوبند بھی اس وقت گریز میں موجود تھے اور آپ خود دیوبند چلے گئے۔ اور ماہ اگست ۱۹۸۰ء میں آپ نے باضابطہ جمعہ کا فتویٰ دیوبند سے لایا اور جامع مسجد داور میں ایک بڑی جماعت کی موجودگی میں گریز میں جمعہ قائم کرنے کا فتویٰ پڑھکر سنایا۔ اس طرح سے ان تمام خدشات کا خاتمہ ہوا اور اب گریز میں موضع داور میں باقاعدہ جمعہ پڑھا جانے لگا۔ اس کے ساتھ اب گریز سے بچے باضابطہ طور پر دیوبند دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جانے لگے۔ اس دوڑ میں گریز کے ساتھ ساتھ اب وادی تُلیل سے بھی بچے دیوبند چلے گئے۔

اس دوران جمعہ نماز مولوی فتح محمد شاہ صاحب اور اُن کے بعد چند ماہ عبدلرحمان بٹ صاحب اور اُن کے بعد جامع مسجد داور کے ہی امام عبدلرحیم ڈار صاحب پڑھاتے رہے۔ سال ۱۹۸۲ء میں مفتی غلام رسول ساموں صاحب فارغ ہوکر واپس آئے تو آپ نے اب باضابطہ طور جامع مسجد داور میں خطیب اور امامت کا منصب سنبھالا۔ اسی سال داور میں جامع مسجد تعمیر کرنے کے لئے کوشش شروع کی گئی۔ تمام علاقے کے لوگوں نے دل کھول کر مدد کی اور ایک عالی شان جامع مسجد کی تعمیر مکمل ہوگئی۔ اس مہم میں مقامی لوگوں کے ساتھ ساتھ یہاں کے پہلے تحصلیدار جناب خواجہ نورلدین داند نے بھی کلیدی رول ادا کیا۔

اب چونکہ علاقہ میں ایک اچھا خاصا دینی مزاج قائم ہو چکا تھا اور اس موقعہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت مفتی غلام رسول ساموں صاحب نے یہاں پر ایک دینی

مدرسہ قائم کرنے کی سعی شروع کی اور یہاں کے معززین اور باثر لوگوں کے ساتھ مختلف ملاقاتوں اور چند نشستوں کے بعد ۱۳ اگست ۱۹۸۳ء کوداور میں ایک دینی مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی جس کا نام ''مغزن العلوم'' رکھا گیا۔ اس سلسلے کی ایک نشست میں محترم محمد انور ساموں صاحب بھی شامل ہوئے آپ نے ایک مدلل تقریر بھی کی اور درسگاہ قائم کئے جانے پر زبردست زور دیا اور مفتی صاحب کو حوصلہ بھی دیدیا۔

پندراں طلبا کے اندراج کے ساتھ جسمیں دس لڑکیاں اور پانچ لڑکے تھے۔ اس مدرسہ نے اپنا سفر شروع کیا۔ اور مفتی صاحب کی ذاتی محنت اور اللہ کے فضل وکرم سے پانچ لڑکیوں اور چار لڑکوں نے نہایت قلیل مدت میں ہی کلام اللہ شریف حفظ کیا۔ اور بچے داخلہ لیتے رہے۔ اور اس وقت ایک اچھے ادارے کی صورت میں موجود ہے۔ جہاں پر ایک مسجد شریف کے ساتھ چند عمارات بھی موجود ہیں۔ یہاں پر قیام اور طعام دونوں سہولیات موجود ہیں۔ اور درجنوں نوجوان یہاں سے قرآن شریف حفظ کر کے یا تو ریاست سے باہر مزید تعلیم حاصل کرنے چلے گئے یا پھر یہیں دینی خدمت میں مشغول ہیں۔ اس ادارے کے ذریعے مفتی صاحب نے وادی میں بسی ہوئی بریلویت کے خلاف ایک جدوجہد کی جس کی بدولت گریز میں توحیدی ماحول قائم ہوا اور لوگ بدعات سے کسی حد تک باخبر ہوئے۔ اسی دوران سال ۱۹۹۶ء میں چند گھریلو پریشانیوں کی وجہ سے مفتی صاحب گریز چھوڑ کر سری نگر چلے گئے۔ اور مغزن العلوم کی بھاگ ڈور اُن کے ایک قریبی ساتھی غلام احمد میر کو سونپ دی۔ اس نوجوان مولوی غلام احمد میر نے اس کام کو تا حال بخوبی انجام دیا اور درسگاہ کی ترقی میں کوئی دقیقہ فروگذاست نہیں کیا۔ آپ نے اپنی زاتی کاوش اور محنت سے درسگاہ کی بڑی عمارت جو ایک آتش ناگہانی کی شکار ہوئی تھی اس کی تجدید کے ساتھ دوسری عمارت

بھی تعمیر کرلی اور درسگاہ کے احاطے میں ہی مسجد شریف بھی تعمیر کرڈالی اور اس وقت برابر درسگاہ کا نظام بخوبی سنبھالے ہوئے ہیں۔اُن کے ساتھ دو مقامی مولوی صاحبان بھی اس خدمت میں اُن کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔گریز اور تُلیل میں اس وقت علما کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔جن میں چند قابلِ ذکر حضرات مندرجہ ذیل ہیں۔

مفتی نذیر احمد صاحب قاسمی۔آپ داور کے رہنے والے ہیں۔آپ کے والد صاحب کا نام غلام رسول ڈار ہے۔آپ نے اپنا تعلیمی سفر سال ۱۹۸۲ء میں دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ سے شروع کیا۔آپ نے سال ۱۹۸۳ء میں شمس العلوم نند ھیرہ میں سال اول میں داخلہ لیا اور سال ۱۹۸۴ء میں دارالعلوم دیوبند میں سال دوم میں داخلہ لیا۔سال ۱۹۸۷ء میں کشمیر یونیورسٹی سے مولوی کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۸۸ء میں وہی سے مولوی عالم اور ۱۹۸۹ء میں مولوی فاضل کی ڈگری حاصل کی ۱۹۹۲ء میں پھر دارالعلوم دیوبند سے سال ہفتم پاس کیا ۱۹۹۳ء میں فضیلت کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۹۴ء میں مفتی کورس مکمل کیا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔اے۔عربک کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۹۷ء میں گریز واپس آئے اور Arabic Teaching Centre کی بنیاد ڈالی اور مقامی لڑکوں کو عربی سکھانی شروع کی ۱۹۹۹ء میں آپ محکمہ تعلیم میں بحیثیت اُستاد تعینات ہوئے۔

مولوی غلام رسول بیگ صاحب موضع ملنگام تُلیل کے باشندہ ہیں۔آپ نے اپنا تعلیمی سفر اشرف العلوم تھانہ بھون سے شروع کیا۔اور ۱۹۸۶ء میں مظاہر العلوم سہارنپور سے فضیلت حاصل کی اور اس وقت دارالعلوم بلالیہ میں بحیثیت استاد کام کرتے ہیں۔

مولوی عبدلستار بیگ۔آپ بھی موضع ملنگام تُلیل کے باشندہ ہیں۔اور

ابتدائی تعلیم سوپور سے شروع کی اور دیو بند سے فضیلت حاصل کی اس وقت وادی میں کسی مدرسہ میں کام کرتے ہیں۔

مفتی محمد سلطان صاحب۔ آپ موضع بگلدر ٹلیل کے رہنے والے ہیں۔ اپنا تعلیمی سفر سوپور سے شروع کیا۔ ۱۹۹۳ء میں دارالعلوم دیو بند میں داخلہ لیا۔ ۱۹۹۷ء میں فضیلت حاصل کی اور ۱۹۹۹ء میں مفتی کورس مکمل کیا اس وقت اسلامیہ کالج میں بحثیت استاد کام کرتے ہیں۔

مولوی محمد اسد اللہ شیخ آپ موضع وانپورہ کے رہنے والے ہیں سرینگر سے مولوی فاضل کیا ہے اوراس وقت سرکاری ملازم ہیں۔

مولوی امیر احمد صاحب آپ موضع سرد آب کے رہنے والے تھے۔ آپ دیو بند کے طالبعلم رہ چکے تھے مگر فارغ تحصیل نہیں تھے۔ آپ نے عمر کے آخری ایام میں کنگن ہجرت کی اور وہیں وفات ہوگئے۔

مروجہ تعلیم۔

چونکہ علاقہ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بٹا ہوا تھا۔ لوگ تعلیم سے ناواقف تھے۔ چونکہ باقاعدہ حکومتی نمایندے بھی یہاں موجود نہیں تھے۔ نیابت ہندواڑہ میں تھی۔ لوگوں کو ہر چھوٹے موٹے کام کے لئے ہندواڑہ یا پھر بارہمولہ جانا پڑتا تھا۔ راستہ دشوار گذار اور سال کے بشیتر حصہ میں اکثر مسدود ہی رہتا تھا۔ اسلئے تعلیم وغیرہ کا یہاں باقاعدہ سرکار کی طرف سے کوئی انتظام نہیں تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اچھورہ گاؤں میں خواجہ نور محمد خان نام کا ایک شخص پڑھنا لکھنا جانتا تھا۔ اور داور میں خواجہ احمد میر یہی دو حضرات خط لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ خواجہ نور محمد خان نے موضع اچھورہ میں اپنی زاتی کوششوں سے کچھ نوجوانوں کو ابتدائی چند کتابیں پڑھائی تھیں۔

جن میں اُن کے تین بیٹے، ایک بیٹی اور رشتے کے دواور نوجوان تھے۔ مگر بدقسمتی سے یہ لوگ ابھی باضابطہ کسی سکول میں چند جماعتیں بھی نہیں پڑھ سکے۔ چونکہ سکول بانڈی پورہ میں یا پھر اسکردو میں تھا۔ اور دونوں جگہیں گریز سے کافی دور تھیں۔ اسی زمانے میں داور گاؤں سے تین بچے بانڈی پورہ میں زیر تعلیم ہوئے۔ جو عبدلجبار بٹ، عبدلوہاب کالو اور غلام احمد شیخ تھے۔ ان تینوں حضرات نے ۱۹۱۶ء میں بانڈی پورہ میں پانچویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ اور اس وقت اس امتحان کو .L.P کہتے تھے۔ .L.P پاس کرنے کے بعد یہ تینوں نوجوان ڈوگرہ حکومت کی طرف سے بحشیت استاد تعینات ہوئے اور ان میں سے ایک نوجوان عبدلجبار بٹ صاحب استور میں تعینات ہوئے ۱۹۱۹ء میں عبدلجبار بٹ صاحب کو واپس گریز میں تعینات کیا گیا اور دوسرے دونوں حضرات گریز سے باہر ہی تھے۔ عبدلجبار بٹ کے گریز میں بحشیت استاد تعینات ہونے سے گریز میں مروجہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ اب مقامی لوگوں میں شوق پیدا ہوا۔ اور موضع بڈون سے ایک بچہ عبدلجبار بٹ صاحب کی شاگردی میں چند جماعتیں پڑھ کر مزید تعلیم کے لئے بانڈی پورہ چلا۔ جہاں اُس نے باضابطہ طور مڈل پاس کیا۔ مڈل پاس کرتے ہی آپ بھی بحشیت استاد تعینات ہوئے اور گریز میں ہی آپ کی تعیناتی ہوئی اب گریز میں باضابطہ چند سکول کھولے گئے تھے اور تعلیمی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ کہتے ہیں، داور، بھگتور، وانپورہ اور کلشئ بالا میں ابتدائی سکول کھولے گئے تھے۔ بانڈی پورہ سے مڈل پاس کر کے آنے والے اس نئے استاد کا نام محمد انورساموں تھا۔ عبدلجبار بٹ صاحب کے شاگرد محمد انور ساموں جو بعد میں کافی مشہور ومعروف شخصیت کے مالک بن گئے۔ بٹ صاحب کے شاگردوں میں خواجہ عبدلکریم ڈار صاحب، خواجہ غلام محمد ماگرے صاحب، خواجہ محمد احسن ماگرے صاحب، خواجہ

عبدلجبار شیخ صاحب، ماسٹر عبدلرحیمساموں صاحب اور ماسٹر محمد دلاور لون صاحب جیسی معروف شخصیات قابل زکر ہیں۔ جنہوں نے گریز میں تعلیم کے چٹیل اور بنجر میدان میں اپنی زاتی کوششوں سے ایک زبردست انقلاب لایا۔ اور قلیل مدت میں گریز کی قلیل آبادی کو تعلیم کے نور سے منور کیا۔ ان کی زاتی کوششوں سے نوجوانوں کی ایک اچھی تعداد گریز سے آٹھویں جماعت پاس کرکے بانڈی پورہ میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں اساتذہ کی حثیت سے تعینات ہوئے۔ نئے سکول کھلتے گئے اور یہ سلسلہ برابر چلتا رہا اور ہر چھوٹے بڑے گاؤں میں سکول کھلتے گئے۔ اس طرح ہم خواجہ عبدلجبار بٹ صاحب مرحوم کو گریز میں تعلیم کا بانی کہہ سکتے ہیں۔ آپ ایک خدادوست انسان تھے۔ سادہ طبیت کے مالک تھے۔ شریف النفس اور دیندار تھے۔ ان کے علاوہ کچھ نوجوان اب محکمہ تعلیم سے باہر دوسرے محکمہ جات میں بھی ملازم ہوگئے جن میں خواجہ عبدلعزیز ساموں ساکنہ موضع بڈون محکمہ مال میں پٹواری بن گئے اور اپنی قابلیت اور زہانت کی بدولت نایب تحصیلدار، تحصیلدار، ایس۔ ڈی۔ ایم کے عہدوں پر فایز ہوتے ہوئے کشمیر کے نائب کسٹوڈین جنرل کے عہدے پر فایز ہوئے اور یہی سے اپنی ملازمت سے باعزت سکبدوش ہوئے۔ اور اب تک بقیدحیات ہیں۔ ان کے ہی ایک اور ساتھی خواجہ غلام قادر ماگرے میٹرک پاس کرنے کے بعد سری نگر میں ایس پی کالج سے ایف۔ اے پاس کرکے بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر بن گئے۔ کافی دیر تک گریز میں B.D.O. رہے اور پھر ترقی کے سلسلے میں گریز سے باہر گئے۔ ایک اور ان کا ساتھی جن کا نام خواجہ عبدلستار ساموں ہے وہ بھی میٹرک پاس کرکے پہلے پٹواری کی ٹرنیگ کی مگر بعد میں دیہات سدھار میں ملازم ہوئے اور بحثیت B.D.O. گریز سکبدوش ہوئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو آٹھویں کے بعد

بانڈی پورہ یا پھر وادی کے دوسرے حصوں میں تعلیم حاصل کرنی پڑی۔ اسی جماعت میں سے ایک نوجوان میٹرک پاس کرنے کے بعد سری نگر میں ایس پی کالج سے بی۔ اے کی ڈگری ۱۹۵۹ء میں حاصل کی اور گریز وادی سے یہ پہلا نوجوان تھا جس نے کسی کالج سے باضابطہ گریجویشن حاصل کی۔ اور ۱۹۵۹ء میں محکمہ تعلیم میں بحثیت استاد تعینات ہوئے۔ اب تک داور مڈل سکول کو ہائی سکول کا درجہ ملا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں ہی خواجہ غلام محمد بخشی وزیر اعظم جموں و کشمیر نے اپنے درہ گریز کے دوران یہاں پر ہائی سکول اور ہسپتال کھول دیا تھا۔ اب ہائی سکول کے لئے ایک عمارت بھی بنی تھی جواب تک موجود ہے۔ اس ہائی سکول میں پہلے ہیڈ ماسٹر علاقہ شوپیان سے جناب غلام احمد منٹو تعینات ہوئے تھے۔ گریز کی پوری آبادی پر ان کا احسان ہے کہ اس شریف النفس انسان نے نہایت دیانتداری اور محنت سے گریز کے غریب لوگوں کو تعلیم کے نور سے منور کیا۔ اس دوران اب قریباً ایک درجن لوگوں نے میٹرک کا امتحان بانڈی پورہ میں پاس کیا اور یہ سب لوگ محکمہ تعلیم میں ہی بحثیت استاد تعینات ہوئے۔ جن میں سے کچھ بعد میں پولیس میں آفیسر بن گئے اور تعلیم کے محکمہ کو چھوڑ دیا۔

جناب منٹو صاحب کی ذاتی محنت اور کوشش سے داور ہائی سکول میں میٹرک کا امتحانی سنٹر قائم ہوا اور سال ۱۹۶۰ء کے ماہ مئی میں پہلا (Special Exam) Matric لیا گیا اور اس امتحان میں چار لڑکے شامل ہوئے اور چاروں کامیاب ہوئے۔ اور اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں نو لڑکے امتحان میں شامل ہوئے جن میں سے چار کامیاب ہوئے اور یہ سلسلہ اب برابر جاری رہا۔ اس دوران متذکرہ بالا نوجوان گریجویٹ غلام رسول لون جو موضع کھنڈیال کے ایک مالدار گھرانے کے چشم چراغ تھے نے ۶۵-۱۹۶۴ء میں ایجوکیشن کالج سری نگر سے .B.T کی ڈگری حاصل کی اور

اب وہ (Trained Graduate) کہلانے لگے۔ اور داور ہائی سکول میں بحیثیت 2nd Master تعینات ہوئے۔ آپ انگریزی اور حساب مضمون میں کافی قدرت رکھتے تھے۔ اور نویں اور دسویں جماعت کو آپ ہی باقاعدہ حساب اور انگریزی پڑھاتے تھے۔ علاقہ کافی غریب اور پسماندہ تھا۔ تعلیم بالکل کم تھی گھروں میں بچوں کی تعلیم کا خیال نہ رکھنے کے برابر ہوتا تھے۔ اسلئے اساتذہ پر پورا بوجھ ہوتا تھا۔ مگر اس نوجوان کو اس بات کا شدید احساس تھا اور وہ پوری جان فشانی سے اپنا فرض منصبی نبھاتے تھے۔ چونکہ اس وقت سالانہ امتحان ماہ مارچ میں لیا جاتا تھے۔ اس لئے سرمائی چھٹیوں میں بچے اساتذہ کی کمی کی وجہ سے گھروں میں تقریباً بے کار ہی رہا کرتے تھے۔ مگر آپ نویں اور دسوی جماعت کے بچوں کو حساب اور انگریزی سرمائی چھٹیوں کے دوران بھی اپنے گھر میں پڑھاتے تھے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ بچے امتحان میں پاس ہوسکیں۔ اس دوران وہ کسی ٹیوشن فیس کا تقاضا بھی نہیں کرتے تھے۔ اس دوران ہائی سکول داور میں خواجہ محمد انور ساموں صاحب بھی مڈل سکول وانپورہ سے تبدیل ہو کر آئے۔ اور آپ دونوں حضرات نے پوری زمہ داری کے ساتھ ایک اچھی خاصی تعداد میں نوجوانوں کو داور ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پس کرایا اور خدا کے فضل وکرم سے یہی نوجوان اب گریز میں بحثیت استاد تعینات ہوئے۔ اور گریز کے اطراف واکناف میں پرائمری سکولوں کا آغاز ہوا اور پوری آبادی حصول تعلیم میں لگ گئی۔ فرض شناس اساتذہ کے فرض شناس شاگردوں نے بھی اپنے فرایض کی ادائیگی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ان کے شاگردوں میں سے چند ایک نے اب کالجوں میں بھی داخلہ لیا تھا۔ اور ایک نے Polytechnic College سری نگر میں داخلہ لیا اور دو سال کے کورس کے بعد سول انجیرنیگ میں Draftsman کی

حثیت سے ملازم ہوا۔ جس نے بعد میں گریز میں کافی تعمیراتی کاموں میں دلچسپی سے کام کیا اور اچھا نام کمایا۔

اس دوران غلام رسول لون صاحب اب ہائی سکول داور میں ہیڈ ماسٹر بن گئے اور آپ کی سربراہی میں اور خواجہ محمد انور ساموں صاحب کی رہنمائی میں اس سکول سے چراغ برابر روشن ہوتے رہے اور پوری آبادی کو منور کرتے رہے۔

خواجہ محمد انور ساموں صاحب۔ آپ نے بانڈی پورہ سے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کیا اور بحثیت استاد تعینات ہوئے۔ مڈل سکول وانپورہ سے داور ہائی سکول میں آئے۔ آپ اُردو اور فارسی پڑھاتے تھے۔ نویں اور دسویں جماعت کو اُردو اور فارسی آپ ہی پڑھاتے تھے۔ داور ہائی سکول میں تعیناتی کے بعد آپ نے اُردو بورڈ علی گڈھ سے ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل اور ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ آپ کو علی گڈھ اُردو بورڈ کی طرف سے گولڈ میڈل بھی ملا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے کشمیر یونیورسٹی سے انگریزی کے امتحانات پاس کر کے .B.A کی ڈگری حاصل کی اور .B.A کے بعد سری نگر ایجوکیشن کالج سے .B. Ed کیا اور وہاں آپ نے اپنی ذہانت اور فراست سے پوری درد قوم کو اعلیٰ مقام عطا کیا۔ اس کالج میں آپ کی کافی عزت ہوئی اس کے بعد آپ ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد آپ .T.E.O بانڈی پورہ بھی رہے۔ اس طرح سے آپ نے گریز سے باہر بھی اپنی قابلیت اور ذہانت کے جوہر دکھائے۔ آپ کی خدمات کو شاید کوئی احسان فراموش ہی بھول سکتا ہے۔ آپ دونوں حضرات کو نہایت عزت اور احترام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ آپ دونوں حضرات کی اس خدمت خلق کو قبول فرمائے اور آپ کی روح کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔ آمین!

غلام رسول لون صاحب سال ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۱ء تک گریز میں تحصیل ایجوکیشن آفیسر کے عہدے پر فائز رہے۔ اس دوران آپ نے (Education Elementry) پرائمری تعلیم کے نظام کو تقویت بخشی سکولوں میں پورا سامان فراہم کیا نوجوان اساتذہ کو فرض شناس بنایا اور ایک ایسا مستحکم نظام دیا جو تقریباً ایک دہائی تک پورے زور وشور سے چلتا رہا۔ سال ۱۹۸۲ء میں آپ کو بڈوگام ہائی سکول میں بحثیت ہیڈ ماسٹر تعینات کیا گیا اور مئی ۱۹۸۳ء میں آپ دوران ڈیوٹی بڈوگام ٹکلیل میں اچانک دل کا دورہ پڑنے سے داعی اجل کو لبیک کر گئے۔ اس طرح گریز میں تعلیم کے آسمان کا ایک جگمگاتا ہو ستارہ اچانک غروب ہوا۔ جس سے گریز میں نظام تعلیم کو ایک زبردست دھچکا لگا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آپ کی وفات کے وقت گریز میں چند ٹرینڈ گویجویٹ ضرور موجود تھے۔ جنہوں نے پوری جان فشانی سے کام کیا۔ جن میں سے چند ایک حضرات نے سال ۱۹۸۲ء میں محکمہ تعلیم کو چھوڑ کر کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس جائن کی جن میں غلام احمد شیخ صاحب، عبدلجبار چکٹ صاحب اور عبدلعزیز ساموں صاحب شامل ہیں۔ ان کے جانے سے گریز کے تعلیمی نظام میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا۔ جن کو پُر کرنے میں چند سال ضرور لگ گئے۔ مگر چند ہی سال میں کچھ اور نوجوانوں نے اس کمی کو پورا کیا۔ اور اس طرح سے اب اللہ کے فضل و کرم سے گریز میں تعلیمی ڈھانچہ ریاست کے دوسرے علاقوں سے کافی استوار ہے۔ یہاں اب آرٹس اور سائینس دونوں شعبوں میں پوسٹ گریجویٹ کافی تعداد میں موجود ہیں۔ سال ۱۹۸۳ء تک گریز میں ٹیوشن کی

بدعت بالکل کم تھی مگر ۱۹۸۳ء۔۱۹۸۴ء کے بعد اس بدعت کو زبردست فروغ ملا۔ چند حضرات نے اس بدعت کو زبردست فروغ دیا حتیٰ کہ باضابطہ ٹیوشن کے لئے مصوم طلبا کو ورغلایا تک جانے لگا اور یہ سلسلہ اب تک برابر جاری ہے۔ تاہم کشمیر وادی سے کچھ فرق ضرور ہے۔ گریز وادی کے گریجویٹ حضرات کے بارے میں اگر بات نہ کی جائے گی تو یہ موضوع شاید ادھورا رہ جائے گا۔

گریز سے باقاعدہ کالج سے گریجویشن کرنے والے نوجوان اس طرح سے ہیں۔

۱۔ غلام رسول لون صاحب کھنڈیال

۲۔ محمد خلیل پنو وانپورہ اور اُردو پوسٹ گریجویٹ

۳۔ محمد اشرف ساحل داور اور انگریزی میں پوسٹ گریجویٹ

۴۔ محمد یاسین لون وانپورہ دوسرا B.A., B.Ed.

۵۔ معسود لحسن ساموں بڈون ایم۔اے فارسی (گولڈ میڈلسٹ) اور پہلے K.A.S. آفیسر اور آج ریاست کے Revenue Secretary کے عہدے پر فائیز ہیں۔

۶۔ ڈاکٹر اصغر ساموں صاحب۔ آپ نے ابتدائی طور BVSC and AH کی ڈگری بمبی سے کی۔ اس کے بعد P.G. کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے شیر کشمیر اگریکلچر یونیورسٹی میں ملازمت شروع کی اور وہاں سے آپ نے آئی۔ اے۔ ایس کا امتحان پاس کیا۔ اور اس طرح آپ نہ صرف گریز تحصیل سے بلکہ ضلع بانڈی پورہ کے پہلے آئی۔ اے۔ ایس آفیسر بن گئے۔ آپ پرعزم شخصیت کے مالک ہیں۔

گریز میں ہائر سکنڈری تعلیم۔ سال ۶ ۷ - ۱۹۷۵ء میں ہائی سکول داور کو ترقی دے کر ہائر سکنڈری سکول بنایا گیا اور بد قسمتی سے یہاں پر صرف آرٹس مضامین پڑھانے کا انتظام کیا گیا۔ اور چونکہ اب تک پورے علاقے میں لوگوں میں اپنے بچوں کو تعلیم پڑھانے کا پورا شوق اور زوق آچکا تھا اور لگ بھگ میٹرک پاس کر کے 40% بچے ہائر سکنڈری تعلیم اور اس سے آگے کالج اور پروفیشنل کالجوں میں داخلہ لینے لگے تھے۔ اسلئے آرٹس میں کم ہی لوگ دلچسپی لیتے تھے۔ جس وجہ سے یہ ہائر سکنڈری سکول اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکا کم طلبا اور نا کافی عملہ کی بنا پر یہ سکول نا کام ہوا اور ۱۹۷۷ء میں پھر ہائی سکول ہی بن گیا۔ یہاں پر پھر ہیڈ ماسٹر تعینات ہوا اور پرنسپل اور لکچرار صاحبان کو واپس وادی بلایا گیا۔ پورے پانچ سال بعد ۱۹۸۲ء میں پھر اس سکول کا درجہ بڑھایا گیا اور ہائر سکنڈری بنایا گیا۔ مگر اس وقت سائینس اور آرٹس دونوں مضامین پڑھانے کا انتظام کیا گیا اور تب سے یہ سکول اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہاں سے کافی بچے ریاست کے مختلف کالجوں اور پروفیشنل کالجوں سے تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ خاص کر یہاں کے کافی لوگوں نے سری نگر میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ اور اب تک برابر کر رہے ہیں۔ یہاں کے سب سے پہلے ڈاکٹر غلام جیلانی ساموں صاحب ہیں جنہوں پٹنہ سے .M.B.B.S کی ڈگری حاصل کی گریز کے لوگوں بھر پور خدمت کی اور آج SKIMS میں کام کر رہے ہیں۔ بہت سارے لوگوں نے سائینس مضامین میں پوسٹ گریجویشن ڈگریاں حاصل کی ہیں اور اس وقت اس علاقے میں چار ہائر سکنڈری سکول موجود ہیں (۲) وادی گریز میں، داور، ایز مرگ اور (۲) وادی تُلیل میں بڈوگام اور بڈوآب میں، اور چاروں سکولوں میں مقامی نوجوان پرنسپل کے عہدوں پر فائز ہیں اور ان کے ساتھ

لکچرار بھی مقامی نوجوان ہیں۔اس کے علاوہ داور گریز میں موجود گرلز ہائی سکول بھی ہائر سکنڈری بنا ہے، مگر ابھی یہاں سٹاف نہیں آیا ہے، بہت جلد آنے کی اُمید ہے۔

تعلیم نسواں۔ اگر ہم یہاں پر اس موضوع پر بھی تھوڑی سی بات نہ کریں گے تو موضوع کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ پہلے زمانے میں گریز میں لوگ لڑکیوں کو تعلیم نہیں پڑھاتے تھے۔ کیونکہ تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ سکول وغیرہ نہیں تھے۔ اسلئے لڑکیوں کی تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آزادی کے بعد موضع داور میں ایک خاتون جو شاید بیرون ریاست یا پاکستان کے کسی شہر سے تعلق رکھتی تھی داور کے ایک شریف النفس نوجوان کے نکاح میں ہونے کے باعث گریز وارد ہوئیں۔ یہ شخص عبدلرحیم لون محکمہ جنگلات میں ملازم تھا۔ اور یہ خاتون ایک تعلیم یافتہ تھیں۔ اور انہوں نے اپنے گھر میں اپنی بچیوں اور رشتہ کی بچیوں کو پڑھانا شروع کیا۔ اور اس طرح یہ سلسلہ ان کے ہمسائیوں تک پھیل گیا۔ اور آہستہ آہستہ یہاں پر ایک گرلز سکول کی بنیاد پڑی۔ اور یہی خاتون جن کا اسم گرامی محترمہ صابرہ سلطانہ تھا اس سکول میں استانی مقرر ہوئی اور ان ہی محترمہ نے گریز میں تعلیم نسوان کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے اُن کی اپنی بیٹی مڈل پاس کر کے اسی سکول میں دوسری استانی کی حثیت سے تعینات ہوئی۔ اور اب ان دونوں ماں بیٹی نے بڑی محنت سے لڑکیوں کو پڑھانا شروع کیا اور آس پاس کے نزدیکی گاؤں سے بھی چند ایک لڑکیاں یہاں آنا شروع ہوئیں۔ مگر یہ سلسلہ پانچویں سے آگے نہیں بڑھا۔ مگر چند سال میں ہی موضع بڈون کے ماسٹر محمد دلاور لون نے اپنی دو بیٹوں کو بھی آٹھویں جماعت تک پڑھایا اور آٹھویں جماعت پاس کرتے ہی وہ دونوں بھی محکمہ تعلیم میں استانیاں مقرر ہوئیں۔ بس پھر ایک سلسلہ شروع ہوا۔ اور لوگوں نے اس دیکھا دیکھی میں اپنی بچیوں کو تعلیم دینا شروع کیا اور یہ

سلسلہ دن بدن ترقی کرتا گیا۔ اب علاقے میں کہیں کہیں گرلز پرائمری سکول کھل گئے اور داور میں موجود گرلیز پرائمری سکول مڈل سکول بن گیا تھا۔ اور اس وقت لگ بھگ ہر گاؤں میں سکول موجود ہے۔ اور ہر گھر کی بچیاں باضابطہ بچوں کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ دسویں جماعت تک تو ہر بچی سکول میں پڑھتی ہے۔ بہت ساری بچیوں نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ بہت ساری بچیوں نے یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویشن بھی کی ہے اور بہت ساری لڑکیاں میڈیکل کالجوں سے .M.B.B.S کی ڈگری حاصل کر کے اس وقت بحیثیت ڈاکٹر کام کرتی ہیں۔ الغرض وادی گریز میں اس وقت تعلیم کے میدان میں کافی ترقی ہو چکی ہے۔ اور دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں کوئی گھر ایسا نہیں ہے جس میں کوئی بھی پڑھا لکھا نہیں ہو۔ ہر گھر میں کوئی نہ کوئی کم از کم دسویں جماعت تک ضرور پڑھا ہوا ہے۔ یہاں پر تعلیمی ڈھانچہ اب کافی مضبوط ہے جس کا تھوڑا سا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

	سکول کا درجہ	تعداد
۱۔	ہائر سکنڈری سکول	چار۔ داور، ایزمرگ، بڈوگام، بڈوآب
۲۔	ہائی سکول بائز	چار۔ وانپورہ، اچھورہ، چورون، پُرانا ٹلیل
۳۔	ہائی سکول گرلیز	۱۔ داور
۴۔	مڈل سکول بائز	۳۳
۵۔	مڈل سکول گرلز	۳
۶۔	پرائمری سکول بائز	۳۳
۷۔	پرائمری سکول گرلز	۳

اور ان سکولوں میں فی الوقت پانچ ہزار ایک سو تراسی ۵۱۸۳ بچے زیر تعلیم

ہیں۔ جن میں لڑکے تین ہزار چوہتر اور لڑکیاں دو ہزار ایک سونو ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پر ایک پرائیوٹ سکول حبہ خاتون انگلیش میڈم سکول کے نام سے قائیم ہوا۔ جس میں بچوں کی تعداد ایک سو چھیانوے ہے۔ یہاں انگریزی میڈئم میں پڑھایا جاتا ہے۔ یہاں سے ایک درجن سے زیادہ بچے اس وقت جواہر نو دوصیا وڈیالہ اوڑی اور سینک سکول مانسبل میں زیر تعلیم ہیں۔ الغرض شبعہ تعلیم میں اس وقت گریز نے کافی ترقی کی ہے۔ اور موجودہ پیڑھی کا کوئی بھی فرد ان پڑھ نہیں ہے کم از کم دسویں جماعت تک پڑھا ہوا ہے۔

انتظامی امور۔ ۱۹۴۷ء تک تو کشمیر مہاراجہ ہری سنگھ کے زیر انتظام تھا۔ اور مہاراجہ کی حکومت جموں سے لیکر شمال میں گلگت تک پھیلی ہوئی تھی۔ لداخ صوبہ بھی ڈوگرہ شاہی کے زیر انتظام تھا۔ اس طرح سے جموں وکشمیر اس وقت چار صوبوں میں مشتمل تھا۔

صوبہ جموں

صوبہ کشمیر

صوبہ لداخ

صوبہ گلگت

چونکہ گریز سری نگر اور گلگت کے درمیان میں واقع ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر یہاں بھی ڈوگرہ حکومت ہی رہی ہوگی مگر تحقیق سے پتہ چلا کہ ڈوگرہ حکومت کا کوئی باقاعدہ انتظامی ڈھانچہ یہاں پر موجود نہیں تھا۔ ایک پولیس حوالدار کے ماتحت چند کانسٹبل موضع داور میں رہتے تھے۔ ایک ڈاکخانہ ہوا کرتا تھا۔ کہتے ہیں اس وقت محکمہ ڈاک اپنی کارکردگی کے لئے کافی مشہور تھا۔ چونکہ اس راستے سے چین اور وسط ایشا

کے دوسرے ممالک سے بھی ہندوستان کا رابطہ ہوا کرتا تھا۔ اور ڈاک وغیرہ اسی راستے سے ہی چلا کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ڈاک لیکر مزدوروں کا قافلہ چلا کرتا تھا۔ بانڈی پورہ سے گلگت تک راستے میں ہر دس بارہ میل کی دوری پر ایک ڈاک چوکی ہوا کرتی تھی جس میں ڈاک کے کارندوں کے رہنے اور کھانے پینے کا انتظام ہوا کرتا تھا۔ ان ڈاک چوکیوں میں تراگ بل، رازدان، زیڈکوسی، کنزلون اور چلم چوکی قابل ذکر ہیں۔ بانڈی پورہ اور گریز کے درمیان تراگ بل، ہوکھ تجی، رازدان، زیڈکوسی اور کنزلون میں ان ڈاک چوکیوں کا وجود اب بھی پایا جاتا ہے۔ اب ریاستی سرکار نے اس راستے میں پیدل چلنے والوں کے لئے کورگبل، زیڈکوسی اور ہوکھ تجی میں سرائیاں تعمیر کی ہیں جن سے پیدل چلنے والوں کو سردیوں کے موسم میں کافی آسائیش میسر ہوتی ہے۔

اُن دنوں اس ڈاکخانہ میں تار (Telegraph) کا انتظام ہوا کرتا تھا جو لگ بھگ اُسی کی دہائی تک موجود تھا۔ Telegraph کا نظام بہت اچھا تھا۔ گریز جیسے دور دراز علاقے کے لوگوں کو نظام تار سے کافی آسانی ہوتی تھی۔ مہینوں کے بعد خطوط ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے تھے اور اب بھی سردیوں میں یہی حال ہے۔ مگر (Telegraph System) سے یہ مشکل کافی آسان ہوتی تھی۔ مگر اب یہ نظام موجود نہیں ہے۔ اس کی جگہ ٹیلفون ایکسچنج نے لے لی ہے۔ جو اکثر و بیشتر خراب ہی رہتا ہے۔ سول انتظامیہ کا کوئی زمہ دار آفیسر یہاں موجود نہیں تھا۔ اور لوگوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے مسائیل لیکر ہندواڑہ جانا پڑتا تھا۔

صحت عامہ کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ لوگ دیسی طریقے علاج پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی انگریز ڈاکٹر اپنے سفر کے دوران کسی مریض کا علاج وغیرہ کرتے تھے۔ جن کا زکر Dr. Asther View نے اپنے سفرنامے میں

ضرور کیا ہے۔آپ نے لکھا ہے کہ گھاس کے بستر ے پر مریض کو درختوں کے سایہ میں لٹا کر آپ نے آنکھوں کے آپریشن کئے ہیں۔ یہ Catract کے آپریشن ہوا کرتے تھے۔

کہتے ہیں کہ چالیس (۴۰) کی دہائی میں شیخ محمد عبداللہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ گریز وارد ہوئے اور یہاں پر عام لوگوں کو ہم خیال بنانے کے لئے ایک جلسے عام سے خطاب بھی کیا۔ اور اسی راستے سے گلگت کے لئے روانہ ہوئے اس کے ساتھیوں میں اچھورہ گاؤں کے نور محمد خان بھی شامل تھے۔ جن کی ملاقات سری نگر میں شیخ محمد عبداللہ سے ہوئی تھی۔اور گلگت سے واپسی پر اسکردو سے ہوتے ہوئے تکیل علاقے میں داخل ہوئے اور وہاں سے سونہ مرگ کے راستے سری نگر واپس آئے۔اس سفر کے دوران جناب شیخ محمد عبداللہ نے گریز میں چند لوگوں کو ہم خیال بنایا۔ کیونکہ آبادی بالکل کم تھی لوگ ذہنی طور ابھی بالکل پسماندہ تھے۔تعلیم نام کی چیز ابھی بالکل نہ ہونے کے برابر تھی۔لوگوں کو سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔وقت گذرتا گیا۔ حالات بدلتے گئے اور اسی دوران ملک ہندوستان بٹ گیا۔اور پاکستان وجود میں آ گیا۔اس کا اثر ریاست جموں وکشمیر میں بھی پڑھ گیا۔ چونکہ شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۳۱ء سے کشمیر چھوڑ وتحریک شروع کی تھی مہاراجہ ہری سنگھ جمہوری تحریک کے سامنے بے بس ہو چکا تھا۔اور تقسیم ملک کے اثرات ریاست میں بھی پڑے لگے۔مہاراجہ کی کمزوری کا فایدہ اٹھاتے ہوئے قبائیلوں نے اوڑی کے راستے سے سری نگر پر حملہ کیا جس حملے کو بارہمولہ میں تھوڑی دیر کے لئے روکا گیا۔مگر چونکہ مہاراجہ کی فوج شاید اس حملے کو روک نہیں سکی اسلئے قبائیلی سری نگر کی طرف پیش قدمی جاری رکھے ہوئے تھے۔اب مہاراجہ ہری سنگھ نے دہلی سے فوجی مدد کی درخواست کی۔مگر دہلی سے بھارت سرکار

تھے۔ گلگت گریز سے تقریباً چار ساڑھے چار سو میل دُور تھا۔ جہاں تک رسائی کافی مشکل تھی۔ اور بانڈی پورہ صرف ۶۰ اور ۷۰ میل کے قریب ہے۔ جہاں تک رسائی قدرے نزدیک تھی اور گریز کے لوگوں کو زندگی کی کرِن بانڈی پورہ کی طرف ہی دکھنے لگی۔ اس لئے گریز کے ذی شعوار لوگوں نے فیصلہ کیا کہ وہ سری نگر سے رابطہ کریں گے۔ اسلئے اس سلسلے میں چند ایک نوجوان جن میں کھنڈیال کے غلام احمد ساموں، وانپورہ کے خواجہ غلام احمد لون وغیرہ وغیرہ شامل تھے پہاڑی راستوں کو استعمال کر کے بانڈی پورہ داخل ہوئے اور یہاں کے ایک شخص عبدلکبیر خان المعروف جیل بابا سے ملاقات ہوئی چونکہ جیل بابا اب تک شیخ محمد عبداللہ کی جماعت میں متحرک ہو چکا تھا۔ اور اس نے گریز کے لوگوں کی رائے کو فوراً جناب شیخ محمد عبداللہ کی خدمت تک پہنچایا۔

اور اس طرح وزیراعظم کشمیر جناب شیخ محمد عبداللہ نے افواج کو گریز کا رُخ کرنے کا حکم دیا اور اس طرح چار جولائی ۱۹۴۸ء کو بھارتی افواج ان نوجوانوں کی رہنمائی میں پہاڑی راستے سے ہوتے ہوئے داور گریز میں داخل ہوگئی۔ اور اپنا پہلا پڑاؤ داور اور مرکوٹ کے درمیان موجود تاریخی قعلہ میں ڈال دیا۔ جواب زمانے کے ہاتھوں پامال ہو کر ایک کھنڈر کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس تاریخی مقام کو محفوظ رکھنا ایک تاریخی ضرورت تھی مگر چند خودغرض اور لالچی انسانوں نے چند سکوں کی خاطر اس کی اصلی ہیت کو بگاڑ دیا۔ یہ قعلہ شاید کوروا اور پانڈوں کی نشانی ہے کیونکہ ایسے ٹیلے گریز میں دو ایک جگہ اور بھی موجود ہیں۔ مرکوٹ پل کے پاس دریائے کشن گنگا کے دونوں اطراف ایسے دو ٹیلے موجود تھے۔ ایک تو اس وقت بھی اپنی اصلی ہیت میں موجود ہے اور دوسرا زیر تذکرہ اپنی اصلی ہیت کھو چکا ہے۔

بھارتی افواج کے گریز میں داخل ہوتے ہی گریز میں موجود قبائیل فرار

ہوئے اور ”فرساٹ“ یعنی تمام میں موجود قبائیلی دستہ بھی چورون کے راستہ فرار ہوا۔
اس دوران انڈین ائرفورس کے چند بمبار جہاز بھی گریز آئے اور اِکا دُکا جگہوں پر بمباری بھی کی جس سے چند ایک لوگوں کی جانیں بھی گئیں۔ اور اس فراری کے عالم میں قبائیلوں نے چورون کے قریب دریائے کشن گنگا پر موجود پُل کو بھی کاٹ دیا۔ اس کے علاوہ کچھ اور رابطہ پل بھی کاٹ دئے گئے تھے۔ گاؤں سے گاؤں تک رابطہ مشکل ہوگیا تھا لوگ کافی پریشان تھے راشن وغیرہ ختم ہو چکا تھا۔ کہیں کہیں ان قبائیلوں کے ٹھکانوں پر موجود راشن جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے لوگوں نے اپنے استعمال میں لایا اور حالات کے معمول پر آنے کا انتظار کرنے لگے۔
ہندوستانی افواج کے گریز میں داخل ہوتے ہی اُن کا رابطہ گریز کے عام لوگوں سے ہوا۔ فوج نے گھبرائے ہوئے لوگوں کو حوصلہ دیا۔ بحالی کا کام شروع ہوا۔ فوجی ڈاکٹرون نے گاؤں گاؤں جاکر لوگوں کو مفت دوائیاں دینی شروع کیں اور اس طرح سے لوگوں کے دل جیتنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔
اس بار فوج موضع اچھورہ سے تھوڑی دور چورون گاؤں اور اچھورہ گاؤں کے درمیان میں شمالی مشرق میں ٹھہر گئی اور دوسری جانب جنوب مشرق میں موضع اچھورہ میں ہی حبہ خاتون پہاڑ کے دامن میں تُلیل وادی کی جانب جانے والی پگڈنڈں پر ٹھہر گئی اور مغرب میں کنزلون میں ٹھہر گئی اور اس طرح گریز اب کسی باہری حملے سے محفوظ ہوگیا۔ اب تُلیل وادی جو گریز سے تقریباً چودہ پندراں کلومیٹر دور ہے وہاں پر کوئی انتظام نہیں تھا۔ لوگ بے یار و مددگار تھے۔ اُن کو کافی پریشانیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ قبائیلوں کی ایک جماعت جو وہاں پہلے سے ہی موجود تھی۔ اُن کے ہاتھوں تُلیل کی آبادی کافی پریشان ہو چکی تھی۔

اس دوران گلگت میں موجود ڈوگرہ سکوٹس کے جوان اسکردو کے راستے فرار ہو کر وادی ٹلیل میں داخل ہو گئے اور وہاں سے پہاڑی راستے سے جوڈارہ سے ہوتے ہوئے کنگن میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ مئی ۱۹۴۹ء میں بھارتی فوج اچھورہ سے چک نالے سے ہوتے ہوئے ٹلیل میں قابض ہو گئے اور اس طرح اب ٹلیل علاقہ بھی ہندوستانی فوج کے قبضے میں آ گیا۔

بانڈی پورہ سے گلگت جانے والا راستہ کھوپری سے ہوتے ہوئے آتا تھا۔ اور وانپورہ اور مرکوٹ کے مقام پر دریائے کشن گنگا کے اوپر پل تھے۔ جو دونوں تباہ ہو چکے تھے۔ اسلئے پورا علاقہ جو دریائے کے دائیں جانب تھا اس کیلئے دریا پر ایک پل کا ہونا نہایت ضروری تھا۔ لوگ عارضی طور پر پہاڑی راستے سے دودھ کھتو اور وجی گلی سے بانڈی پورہ آتے جاتے تھے۔ مگر کنزلون جھگتور اور بانڈی پورہ سے آنے والے لوگوں کو گریز میں داخل ہونا نہایت دشوار ہو گیا تھا۔ اسلئے پہلا کام پل بنانا تھا۔

بھارتی افواج کے گریز میں داخل ہوتے ہی بانڈی پورہ سے حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے عبدلکبیر خان (جیل بابا) بھی گریز میں داخل ہوا۔ اور یہاں آتے ہی اس نے گریز کے باشعور لوگوں سے ملاقات کی۔ چونکہ گریز میں لوگ ابھی تعلیم کے نور سے منور نہیں تھے۔ چند ایک نوجوان جو پرائمری پاس کر کے اساتذہ بھرتی ہو چکے تھے۔ بڈون میں ایک نوجوان تھا جو اس وقت مڈل پاس کر کے بانڈی پورہ سے آیا تھا کافی ذہین اور دیندار تھا جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ ابھی ابھی ہی استاد مقرر ہوا تھا۔ موضع وانپورہ میں پرائمری سکول میں تعینات تھا۔ جیل بابا کی نظر اُن پر گئی اور آپ کو ماسٹری کے ساتھ ساتھ لیبر آفیسر کا چارج بھی دیا گیا۔ اور آپ کی زیر نگرانی موضع وانپورہ کے پاس دریائے کشن گنگا پر ایک عارضی پُل بنانے کا کام شروع کیا گیا۔

اس میں ہندوستانی فوج بھی شامل ہوگئی۔ پل کی تعمیر کے دوران حادثاتی طور پر پل ٹوٹ گیا۔ اور کافی لوگ دریا میں بہہ گئے جن کو مقامی لوگوں اور فوج کے جوانوں نے مشکلاً بچا لیا۔ اور کچھ قیمتی جانیں تلف بھی ہوگئیں ۔ اس حادثہ کا اس نوجوان پر زبردست اثر پڑا اور پل بن جانے کے بعد آپ نے یہ اضافی عہدہ چھوڑ دیا اور اپنا اصلی کام درس وتدریس شروع کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی کہ اس شخصیت کا مدرس رہنا ہی اس علاقے کے لوگوں کے لئے فایدہ مند تھا۔ شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی عہدے سے منسلک رکھا۔ آپ نے بحثیت مدرس اپنے لوگوں کو جتنا کچھ دیا شاید کسی دوسرے عہدے پر رہ کر نہیں دے پاتے۔

اب چونکہ ریاست میں باضابطہ طور پر جمہوری حکومت قائم ہو چکی تھی جس کی قیادت جناب شیخ محمد عبداللہ کرتے تھے۔ تمام شخصی مظالم ختم ہو چکے تھے اور اصلاحات شروع ہو چکے تھے۔ انتظامی امور کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی۔ تعلیم اور صحت عامہ کی طرف بھی خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ گریز میں بھی اب حکومت کے کارندے آچکے تھے۔ نائب تحصیلدار کا دفتر داور اور مرکوٹ کے درمیان واقعہ قلعہ نما ٹیلے پر قائم ہو چکا تھا جس کا زکر اُپر کیا جا چکا ہے۔ پولیس چوکی نے بھی باضابطہ کام کاج شروع کیا تھا۔ ہسپتال میں بھی ایک کمپونڈر کی سربراہی میں کام ہو رہا تھا اکثر بیماروں کو علاج فوجی ڈاکٹر ہی کرتے تھے۔

گریز میں چونکہ کوئی سیاسی قیادت موجود نہیں تھی ایک واحد شخص جو جناب شیخ محمد عبداللہ کے کچھ قریبی ساتھیوں میں تھا اور سفر گلگت میں اُن کے ہمراہ تھا۔ مجھے صوفی محی الدین صاحب نے سال ۱۹۹۵ء میں گریز میں اپنے سفر کے دوران ذاتی طور پر بنایا کہ نور محمد خان اچھورہ کے شیخ صاحب اور اُن کے ساتھی مرزا محمد افضل بیگ

صاحب، صوفی محمد اکبر صاحب اور مولانا محمد سعید مسعودی کے ساتھ قریبی روابط تھے۔ مگر بدقسمتی سے زندگی نے اُن کا ساتھ نہ دیا اور وہ وفات ہو چکے۔ اس طرح گریز میں اب کوئی سیاسی قیادت موجود نہیں تھی۔ اس لئے گریز میں سیاسی امور کی دیکھ بھال جناب عبدلکبیر صاحب بانڈی پورہ سے ہی کر رہے تھے۔ اور اس افراتفری کے ماحول میں بانڈی پورہ سے ہی گریز کی دیکھ ریکھ ہوتی تھی۔ گریز میں چونکہ تعمیر نو کا کام شروع کرنا تھا اسکے لئے کافی دوڑ دھوپ کی ضرورت تھی مگر گریز میں اب تک کوئی باقاعدہ سیاسی جماعت کا وجود بھی عمل میں نہیں آیا تھا۔ اس کا فایدہ جیل بابا نے اپنی سیاسی بصیرت سے خوب اٹھایا اور بانڈی پورہ سے اپنے قریبی رشتے داروں اور ساتھیوں کی ایک جماعت کو ایک فرم بنا کر گریز کے امور کا مالک بنا دیا اس کا نام لال فرم رکھا۔ یہ لال فرم گریز کے تمام معملات پر اس طرح قابض رہی کہ ان کی مرضی کے بغیر گریز میں ایک معمولی سا کام بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ گریز میں راشن کی تقسیم کاری، تعمیر و ترقی، نوکریوں میں تقرری اور دوسرے امور وغیرہ لال فرم کی سفارش سے ہوتے تھے۔ الغرض گریز کی بھاگ ڈور لال فرم کے ہاتھوں میں تھی۔ چونکہ شیخ محمد عبداللہ کی حکومت ۱۹۵۳ء میں ختم ہوئی وہ کسی سازش کا شکار ہوئے اور اُن کو گرفتار کر کے جیل بھیجدیا گیا۔ اور بخشی غلام محمد ریاست کے نئے وزیر اعظم بن گئے۔ ۱۹۵۹ء میں جناب بخشی غلام محمد نے گریز کا دورہ کیا اور آپ نے داور میں ایک ہائی سکول اور ایک ہسپتال کھولنے کا اعلان کیا اور گریز کے لوگوں کے لئے ماہانہ راشن فراہم کرنے کے لئے گریز میں ہی ایک راشن گھاٹ کھولنے کا بھی اعلان کیا گیا۔ ہائی سکول میں بچوں کو نویں اور دسویں جماعت پڑھائی جانے لگیں اور ہسپتال میں ایک تربیت یافتہ ڈاکٹر بھی تعنیات کیا گیا۔

اس دوران مولوی محمد انور سامون صاحب کی ذاتی کوششوں سے اور اُن کے مشورے میں گریز میں چند لوگ اپنے علاقے کے مسائیل حل کرانے کے لئے فعال ہو چکے تھے۔ مگر لال فرم کے سامنے ان کی کچھ نہیں چلتی تھی۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔

اب ریاست میں جناب غلام محمد صادق صاحب کا دور آ گیا آپ ریاست کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ ریاست میں کانگریس جماعت کی حکومت بن گئی۔ صادق صاحب نے گریز کا دورہ کیا اور یہاں کی غربت پسماندگی کو دیکھ کر آپ نے یہاں کی ترقی کے لئے ذاتی دلچسپی لینی شروع کی۔ اور گریز کی ترقی میں نمایاں آثار نظر آنے لگے۔ لال فرم کا اثر کم ہو چکا تھا مگر پھر بھی اکثر گریز کی تقدیر کے فیصلے بانڈی پورہ کے ایک ہوٹل (نشاط ہوٹل) میں ہی ہوا کرتے تھے۔ گریز کے لوگوں کو کسی بھی بات پر اعتماد میں نہیں لیا جاتا تھا۔ ایم۔ ایل۔ اے بھی چونکہ بانڈی پورہ سے ہی ہوا کرتا تھا۔ جو صرف ووٹ حاصل کرنے کے وقت ہی گریز آ کر چند وعدے کر جاتا تھا جو کبھی وفا نہیں ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جولائی ۱۹۶۵ء میں ریاست میں پھر کچھ دراندازی شروع ہوئی۔ گریز ٹلیل میں بھی کچھ دراندازی ہوئی جس سے موضع گنڈ گلہ شیخ تک کا علاقہ متاثر ہوا۔ دراندازوں نے پہاڑی راستوں کو استعمال کیا۔ چونکہ ٹلیل علاقے میں اس وقت فوج کے چند جوان ہی موضع نیرو میں تعینات ہوا کرتے تھے۔ جو کبھی کبھی بڈوآب تک گشت کرتے تھے۔ اس موقعے کا فایدہ اٹھا کر دراندازوں کی ایک جماعت بڈوآب نالے سے اتر کر موضع گنڈ گلہ شیخ تک پھیل گئی۔ اس دراندازی کے دوران موضع بڈوآب اور موضع گجران میں تعینات دو اساتذہ کو دراندازوں نے گرفتار کر کے اپنے ساتھ لیا۔ اور کچھ عرصے کے بعد انہیں رہا کیا گیا۔ اور وہ واپس

اپنے گھر آئے۔ اس دوران فوج نے پورے تلیل علاقے میں اپنی چوکیاں قائم کیں۔ اور حالات پر قابو پایا۔

سال ۱۹۷۴ء میں شیخ محمد عبداللہ اور اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند کے درمیان ایک معاہدہ ہوا اور جناب شیخ صاحب ریاست کے وزیر اعلیٰ بنے اور برسر اقتدار کانگریس کے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم عہدے سے مستعفی ہوئے اور حکومت شیخ صاحب کے حوالے کردی۔ جناب شیخ صاحب نے وزیر اعلیٰ بننے کے بعد اگست ۱۹۷۵ء میں گریز اور تلیل کا دورہ کیا۔ یہاں کی پسماندگی کا آپ نے زبردست نوٹس لیا۔ اور آپ نے گریز کے لوگوں کو ترقی کی راہ پر لیجانے کا یقین دلایا۔ لوگوں کو ترقیاتی کاموں میں عملاً شامل کیا۔ اور یہاں کے ترقیاتی عمل کی دیکھ ریکھ کرنے کے لئے ایک اعلیٰ آفیسر کی تعیناتی کا اعلان کیا۔ اس طرح سے اکتوبر ۱۹۷۸ء میں گریز میں Area Development آفیسر مقرر کیا۔ جواب ترقیاتی کاموں کی نگرانی اور نئے پروجکیٹوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ اسی اثنا میں جناب شیخ صاحب نے گریز کو سب ڈویژن کا درجہ دے کر ایک آئی۔ اے۔ ایس (I.A.S) آفیسر کو بحیثیت ایس۔ ڈی۔ ایم تعینات کیا۔ تاکہ گریز کے لوگوں کو چھوٹے موٹے کاموں کے لئے بانڈی پورہ یا سوپور نہیں جانا پڑے۔ بدقسمتی سے یہ ایس۔ ڈی۔ ایم پوسٹ صرف دو سال تک رہا اور ۱۹۷۹ء میں یہ پوسٹ واپس لیا گیا۔ مگر اس سے ترقیاتی امور میں کوئی فرق نہیں پڑا اور مارچ ۲۰۰۴ء سے گریز میں پھر S.D.M. تعینات کیا گیا۔ جو اس وقت برابر کام کر رہا ہے۔

سال ۱۹۷۷ء میں گریز کو لجسلیٹو کونسل میں نمائندگی ملی اور گریز کے ایک ریٹائیڈ استاد محمد دلاور لون کو ممبر لجسلیٹو کونسل بنا کر گریز کے لوگوں کی ایک دیرینہ مانگ

پوری کردی گئی۔ جس کے لئے گریز کے عوام نیشنل کانفرنس کے بالعموم اور جناب شیخ محمد عبداللہ کے بالخصوص احسان مند ہیں۔ یہاں سے گریز کی ترقی کا عملی دور شروع ہوا۔اور گریز کی تقدیر کے فیصلے اب نشاط ہوٹل بانڈی پورہ کے بجائے (Legeslative Council) میں ہونے لگے۔

۱۹۸۲ء میں ماہ ستمبر میں گریز کو تحصیل کا درجہ ملا اور جناب شیخ صاحب نے بذات خود تحصیل آفس کا افتتاح کیا۔ اور خواجہ نورلدین داند گریز کے پہلے تحصلیدار تعینات ہوئے۔ علاقے کو بنیادی ڈھانچہ فراہم کرنے کے لئے یہاں کے لئے ایک Special Sub Division (PWD) قائم کیا گیا۔ اور یہاں پر ایک ایکزیکٹیو انجینئر اور اس کی نگرانی میں R&B، P.H. E; اور Irrigation کے لئے تین اسٹنٹ انجینئر بھی تعینات کئے گئے۔ اس سپیشل سب ڈویژن کے بننے سے گریز میں بنیادی ڈھانچے کے ساتھ ساتھ سڑکیں، پل، پینے کا پانی، آبپاشی کی نہریں وغیرہ تمام سہولیات لوگوں کو میسر ہوئی۔ یہ سلسلہ اب تک برابر جاری ہے اور گریز میں اب ہر میدان میں نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی۔ داور ہسپتال میں جہاں صرف ایک ڈاکٹر ہوتا تھا۔ اب پانچ ڈاکٹر نظر آتے تھے۔ ہسپتال میں ہر وقت ڈاکٹر موجود رہتے تھے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر اور ایک ڈنٹل سرجن بھی موجود ہوا کرتا تھا۔ ہسپتال میں لیبارٹری اور ایکس رے میشن بھی نصب ہوگئی۔ نیز مرکزی حکومت کی طرف سے چلایا جانے والا ایک ٹیلی ویژن سیٹشن موضع اچھورہ میں واقع ہے۔ سال ۱۹۷۴ء میں ماہ اکتوبر میں جناب شیخ محمد عبداللہ نے گریز کا دورہ کیا اور ماہ فروری ۱۹۷۵ء میں آپ نے ریاست میں وزیراعلیٰ کی حثیت سے دوبارہ حکومت سنبھالی۔ اس کے بعد گریز میں بھی اب چند نوجوان آپ کی جماعت میں شامل ہوئے اور گریز میں بھی سیاسی سرگرمیاں شروع

ہوگئیں۔ اور سال ۱۹۷۷ء میں گریز سے ماسٹر محمد دلاور لون کو ریاست میں (Legeslative Council) کا ممبر بنادیا گیا۔ مگر یہ سلسلہ چند سال تک ہی چلا چونکہ ماسٹر محمد دلاور نے اپنی معیاد پوری ہونے سے پہلے ہی پارٹی کے کہنے پر استعفٰی دے دیا۔

دریں اثنا ریاست میں وزیر کمشین کی سفارشات پر ریاستی اسمبلی میں چند سیٹیں بڑھادی گئیں۔ اوراس سلسلے میں وادی گریز کو الگ سیٹ مل گئی۔ کیونکہ نوے کی دہائی میں ریاست میں زبردست افراتفری پھیل گئی اروریاست میں گورنرراج نافذ کیا گیا۔ ۱۹۹۶ء میں جب ریاست میں انتخابات کرائے گئے تو اس وقت گریز کی سیٹ کے لئے اب گریز کے مقامی لوگوں نے الکشن میں حصہ لیا۔ چند لوگ مختلف سیاسی جماعتوں کی پشت پناہی سے میدان میں اُتر گئے جن میں کانگریس کے میر حمیداللہ، نیشنل کانفرنس کے محمد انور شنگرو، جنتادل کے نذیر احمد خاں اور ایک اور آزاد اُمیدوار محمد انور شیخ قابل زکر ہیں۔ اِن میں ہی ایک اور نوجوان سرکاری نوکری سے استعفٰی دے کر بطور آزاد اُمیدوار چناؤ میدان میں اُترآئے۔ ان کا نام فقیر محمد خان ہے۔ ان کی پشت پناہی چند مقامی بارسوخ اشخاص کررہے تھے۔ اور نہایت دوڑ دھوپ کے بعد قلیل مدت میں ہی آپ کے حق میں میدان ہموار کیا۔ اور مقابلہ میں فقیر محمد خان صاحب نے نیشنل کانفرنس کے اُمیدوار محمد انور شنگرو صاحب کو چند سو ووٹوں سے ہارالیا اس طرح آپ نے ریاستی اسمبلی میں تحصیل گریز سے پہلے نمانیدے کی حثیت سے اپنانام درج کرلیا۔

آپ نے پورے چھ سال گریز کی نمایندگی کی۔ آپ مزاج سے نہایت شریف النفس شخصیت ہیں۔ چونکہ سیاست کے میدان میں نئے تھے۔ اس لئے سیاسی

داؤپیچ پوری طرح سمجھ نہ سکے اور چند خودغرض عناصر کے جال میں اس طرح پھنس گئے کہ لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے کے بجائے کھوتے گئے۔ اور نتیجۂ سال ۲۰۰۲ء کے انتخاب میں نیشنل کانفرنس نے آپ کو منڈیٹ نہیں دیا۔ اور آپ نے کانگریس کی ٹکٹ پر چناؤ لڑا چناؤ ہار گئے۔ اس دوران ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۲ء تک جنتا دل کے نمایندے نذیر احمد خان نے لوگوں میں اپنے آپ کو کافی مقبول کرایا۔ ایک سوشل ورکر کی حثیت سے آپ نے لوگوں کی زبردست خدمت کی۔ اور چھ سال میں آپ نے زبردست حمایت حاصل کی۔ اور ۲۰۰۲ء کے ایلکشن میں نیشنل کانفرنس نے ان کو منڈیٹ دے کر اپنے اُمیدوار کی حثیت سے میدان میں اُتار دیا۔ اور آپ نامزدگی کے بعد جب وارد گریز ہوئے تو پورا علاقہ کنزلون سے لیکر چورون تک جلوس کی شکل میں نکل آیا اور آپ کی حمایت کا برملا اظہار کیا۔ اور چناؤ کے روز بھاری اکثریت نے آپ کے حق میں ووٹ ڈالکر آپ کو کامیاب کر دیا۔ بحثیت ممبر حلف لیتے ہی آپ لوگوں کی خدمت میں اس طرح جُٹ گئے کہ تجربہ کار لوگ بھی آپ کی داد دینے لگے۔ اس نوجوان نے واقعی ووٹ کا حق ادا کیا۔ پانچ سال کے عرصے میں حزب اختلاف میں ہوتے ہوئے بھی آپ نے اپنے علاقے کی ترقی کے لئے بہت کچھ کیا۔ آپ پانچ سالوں میں تقریباً ہر گھر پر گئے ہونگے۔ اور ہر ووٹر سے ملے ہونگے۔ آپ نے تقریباً گریز کے پونے تین سو پڑھے لکھے نوجوانوں کو تعلیم کے محکمہ میں بطور RET تعینات کروایا۔ ہر گاؤں میں اور ہر محلے میں سکول کھلوایا۔ آنگن واڑی سنٹر کھلوائے۔ تقریباً ۸۵ دیگر نوجون لڑکوں اور لڑکیوں کو بجلی، صحت وغیرہ محکموں میں روزگار دلایا۔ غریب بوڑھے نادار لوگوں اور بیوہ عورتوں کو وظایف دلانے کے لئے خود ذاتی طور کوششیں کیں۔ واقعی آپ نے گریز کا نقشہ بدل دیا۔ اگر پورے گریز میں سیاست کرنے والے حضرات

اسی جذبہ سے سیاست کرتے تو انشاءاللہ عنقریب ہی گریز ترقی کی ہر منزل طے کرتا۔ اور خوشحالی عوام الناس کے قدم چوم لیتی۔ ہر انسان چونکہ حاکم نہیں بن سکتا مگر حاکم کے ہاتھ مضبوط کرنا جب تک وہ حق پر ہو ہر فرد پر واجب ہے۔

رہن سہن اور یہاں کی تہذیب۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ پوری آبادی جو شینا بولتی ہے اور درد قبلیہ سے تعلق رکھتی ہے۔ کوہ ہندوکش سے جبراً نکالی جانے والی یہ قوم کافی دیر تک شمالی علاقاجات گلگت، ہنزا نگر، چلاس، اسکردو، استور سے ہوتے ہوئے کچھ لوگ گریز اور ٹلیل میں آباد ہوگئے۔ اکثریت شمالی علاقاجات میں ہی مقیم ہوگئی۔ جو اپنی اصلی تہذیب کو محفوظ کیے ہوئے ہے۔ ہر قبیلہ کا اپنا ایک رہنے سہنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ اسی طرح درد قبیلہ بھی اپنے ساتھ کچھ روایتی طریقے ساتھ لایا تھا۔

زبان۔

ہماری زبان شینا ہے۔ یہ زبان سنسکرت سے نکلی ہے۔ اکثر الفاظ سنسکرت اور فارسی سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً اسشپ، (شینا)، اسپ (فارسی) گھوڑا (اُردو)، اسشپ اور اسپ آپسمیں کافی ملتے جلتے ہیں۔ شوں، کتا، یہ سنسکرت کا لفظ لگتا۔ ژووں، سردی، سنسکرت کا لفظ ہے۔ چورئی (کشمیری شیسر گانٹھ) یہ بھی سنسکرت کا لفظ لگتا ہے۔ دوئی (پانی) یہ بھی سنسکرت لفظ لگتا ہے۔ اس طرح بہت سارے الفاظ ہیں جو سنسکرت اور فارسی سے آئے ہیں۔ شینا زبان بذات خود ایک مکمل زبان ہے۔ جو بہت سارے لوگ بولتے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے اس کا کوئی باضابطہ رسم لخطہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ مگر شمالی علاقہ جات میں شاید اس کا رسم لخطہ موجود ہے۔ لیکن رسم الخط بناتے ہوئے اس زبان کی اصلی ہیت کو تبدیل کیا ہے۔ چونکہ ریڈیو پاکستان سے باضابطہ شینا

زبان میں پروگرام نشر ہوتا ہے۔اور خاص کر ریڈیو گلگت اور ریڈیو اسکردو سے باضابطہ اس زبان میں غزلیں،نعت،حمد اور ڈرامے وغیرہ باضابطہ نشر ہوتے رہتے ہیں۔ جو کافی معیاری ہوتے ہیں۔ جو شینا ہم بولتے ہیں اس میں اور جو وہ بولتے ہیں اس میں کافی فرق لگتا ہے۔ کیونکہ اس وقت جو زبان ہم گریز میں بولتے ہیں اس میں کافی ملاوٹ آچکی ہے۔ اس میں کشمیری اور انگریزی زبان کا غلبہ لگتا ہے۔ چونکہ علاقہ کا زیادہ میل ملاپ بانڈی پورہ اور سری نگر کے ساتھ ہے اسلئے کشمیری،اُردو اور انگریزی وغیرہ کے کافی الفاظ اس میں داخل ہوگئے ہیں۔اور اصل شینا ہم لگ بھگ بھول رہے ہیں۔ کاش ہمارے پڑھے لکھے لوگ اس طرف دھیان دیتے اور اپنی زبان کی حفاظت اور ترویج کے لئے کچھ کام کرتے اور اس زبان کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لئے باضابطہ رسم لخطہ وغیرہ کے لئے کچھ کام کرتے۔ اس سلسلے میں ساٹھ کی دہائی کے اواخر میں کشمیر یونیورسٹی کے ایک پروفیسر مسٹر T. N. Gunjoo نے کچھ کام بھی کیا تھا مگر بدقسمتی سے اس کا کچھ خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا پروفیسر محی الدین حاجنی صاحب شینا زبان کو کشمیری زبان کی ماں سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اس میں اختلاف رائے ہے۔اور اب تک اس زبان کا کوئی رسم الخط نہیں بن پایا اس زبان کو فی الوقت انگریزی زبان میں کہیں کہیں لکھا گیا ہے۔ خاص کر انگریز سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں شوقیہ چند محاورے یا چند لوگ گیتوں کو ضرور لکھا ہے۔

چند محاورے۔

1. Lao arem the apejo lang bilo

لااٹمیہ،تھے،اپچون لنگ بلو۔

2.Ek dumm agaru daddo duguni shang the---

Once in fire you have been burnt, a second time take care.

چنداسی طرح پہلیاں بھی ہیں۔

May sazik henyn sureo phyryhine bas darre pato buja -

My sister is at day walks, at night door behind.

اگراس ضمن میں کچھ محنت کی جاتی تو ضرور ایک رسم الخط مرتب کیا جاسکتا ہے۔اوراس زبان کاحق ادا کیا جاسکتا ہے۔

پوشاک۔

ہمارے قبیلے کی اصلی پوشاک بھی کچھ مختلف رہی ہے پرانے لوگ اکثر پٹو کا استعمال کرتے تھے۔لداخ میں لوگ ایک لمبا سا چوغہ نما کپڑا پہنتے ہیں جسے وہ غنچہ کہتے ہیں۔اس کے برعکس ہم گریز میں ایک لمبا کپڑا پہنتے ہیں۔جو گول سا ہوتا ہے۔جس کو پھرن کہتے ہیں۔پھرن گول لمبا سا ہوتا ہے۔یہ گردن سے لیکر ٹخنوں تک ہوتا ہے۔مرد ایک ٹوپی پہنتے تھے جو پٹو کی ہوتی تھی اور تقریباً ۱۰۔۱۲ گرہ لمبی ہوتی تھی یہ گول جیسی بنائی جاتی تھی۔یہ بالکل انوکھی جیسی ہوتی تھی۔شمالی علاقہ جات میں یہ ٹوپی اب بھی برابر استعمال ہوتی ہے اور یہ ٹوپی دردقوم کی پہچان ہے۔مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں کشمیری ٹوپی نے بزرگوں میں اور انگریزی فیشن کی ٹوپی (Pick) وغیرہ نے نوجوانوں میں اپنی اصلی ٹوپی کی جگہ لے لی۔آپ کی واقفیت کے لئے ہماری اصلی پوشاک میں میرے اپنے بزرگوں کی یہ تصویر ہے اس سے غور سے دیکھئے اور پھر خود فیصلہ کریں کہ ہم نے اپنی تہذیب اور تمدن کے ساتھ کتنا انصاف کیا ہے۔ترقی ہر قوم کے لئے

نہایت ضروری ہے۔ مگر ترقی کے بہانے ہم اپنے تہذیب اور تمدن کو ہی چھوڑ دیں اور اغیار کی تہذیب کو اپنائیں یہ کہاں کا انصاف ہے۔ پھرن کی بات چلتی تھی عورتوں کے پھرن میں ایک فرق ہوتا تھا۔ لمبائی اور چوڑائی تو جسم کے مطابق ہوا کرتی تھی مگر سینے میں اسکو دوگنا (Double) سِیا جاتا تھا اسکو شوتر کہتے تھے۔ یہ جیب کا کام بھی دیتا تھا۔ سردی میں دونوں ہاتھ اس میں ڈالنے کے کام بھی آتا تھا۔ اور دوگنی سلائی کی خاص وجہ یہ تھی کہ یہ عورتوں کے سینے کو بالکل ٹھیک طرح سے ڈھاپنتا تھا اس پھرن میں عورتوں کا سینہ کبھی بھی اُبرا ہوا نظر نہیں آتا تھا اور اس کی لمبائی بھی برابر ٹخنوں سے نیچے ہوتی تھی۔ سر پر پٹو کی ٹوپی ہوتی تھی۔ اور بزرگ خواتین کے لئے ایک خاص قسم کی ٹوپی جسے ہم ٹوپی تو نہیں کہہ سکتے ہیں۔ درد قوم کے لباس کی ایک خاص شے ہے۔ شینا زبان میں اس ٹوپی کو (ڈوری) کہتے ہیں۔ یہ پٹو کے چار گز لمبے اور چار سے چھ انچ چوڑے ٹکڑے سے بنائی جاتی تھی۔ اس کو لپیٹ کر ہیٹ نما شکل کی بنائی جاتی تھی۔ اور اس کے اُپر ایک لمبا سفید کپڑا اڈالا جاتا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک خاص ٹوپی تھی جو بزرگ خواتین کی بزرگی اور شان کو ظاہر کرتی تھی۔ میں نے اس کا نمونہ کافی کھوجا تھا مگر کہیں دستیاب نہیں ہوا۔ اس ٹوپی کی جگہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ کشمیری قصابہ نے لے لی۔ جو تقریباً دو دہائی تک چلا۔ مگر اب قصابہ بھی ناپید ہوا۔ اب قصابہ کی جگہ ساڑی اور دوپٹہ نے لے لی۔ جوان اور بزرگ خواتین دونوں ہی اس کا استعمال کرتی ہیں۔ تقریباً اسی (۸۰) کی دہائی تک عورتیں بھی مردوں کی طرح قمیض پاجابہ ہی پہن لیتی تھیں مگر اب کوئی بھی جوان یا بزرگ عورت قمیض نہیں پہنتی ہے۔ اب فراق وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔ پوشاک کے معاملے میں ہم نے پورا کشمیری لباس اپنایا ہے۔ اور اس طرح سے وہ پٹو جو ہمارے گھروں میں ہی بنتا تھا۔ اب بالکل ناپید ہو چکا ہے۔ اور

اس کی جگہ بازاری پٹو اور کپڑے نے لے لی ہے۔ قصابہ کا ذکر چلتا تھا۔ عورتوں کے سر پر قصابہ بھی ایک خاص چیز ہوا کرتی تھی۔ اس کے اُپر ایک سفید یا کسی اور رنگ کے کپڑے کی چادر جس کے کنارے سرخ کپڑے کی کناری سے بنائے جاتے تھے ڈالی جاتی تھی۔ اس چادر کا خاص استعمال ہوا کرتا تھا۔ یہ چادر اکثر عورتوں کے چہرے کو ڈھانپے رکھتی تھی۔ اور سردی میں بھی چہرے کو سردی سے بچا لیتی تھی۔ انگریز نے قصابہ کے بارے میں یون لکھا ہے۔

"The women wear a loose dark brown bag upon the head which can be pulled down to protect neck and checks from the wind and snow."..........

مکان۔

اکثر لکڑی کے مکان جو اندر سے مٹی کے پلاسٹر سے سردی سے محفوظ رکھتے ہیں۔ چونکہ سرما بہت ہی سرد اور لمبا ہوتا ہے۔ برف کافی گرتی ہے لوگ کافی غریب تھے۔ اکثر لوگ سردیوں کے موسم میں مال مویشی اور خود ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ اس گھر کی تعمیر ہی ایسی کی جاتی جس میں جانور اور انسانوں دونوں کے رہنے کا انتظام ہوتا تھا۔ صفائی وغیرہ کا کم ہی خیال رکھا جاتا تھا۔ جس وجہ سے اکثر لوگ بیماریوں کا شکار رہتے تھے۔ مال مویشی کے ساتھ مل کر رہنا اور صفائی کی کمی کی وجہ سے بیماریاں اکثر لوگوں کو دبوچ لیتی تھیں۔ تپ دق کی بیماری عام تھی سنہ ۱۹۸۰ء کی دہائی تک یہ بیماری پورے علاقے کے لئے ایک زبردست مسلہ بن چکی تھی۔ جنوری ۱۹۷۹ء میں ناچیز نے اس وقت (Tuber Closis Association) کے سکریٹری

ڈاکٹر مرزا جو کہ ڈلگیٹ سری نگر میں مقیم ہوا کرتے تھے اُن سے بار بار مل کر اُن کو گریز میں اس بیماری کی تباہ حال صورت سے آگاہ کیا اور جولائی و اگست ۱۹۷۹ء میں اس کے لئے ایک ٹیم کے زریعے باضابطہ سروے کرائی گئی۔ اور یہاں پرائمری ہیلتھ سنٹر میں باقاعدہ طور پر ٹی۔ بی کے خلاف ادویات کا انتظام کیا گیا۔ اور ان بیماروں کی باضابطہ رجسٹریشن بھی کی گئی۔ تب تک یہ عمل سوپور ہسپتال میں ہوتا تھا۔ تعلیم عام ہونے سے بھی لوگوں میں ایک جاگرتی پیدا ہوئی۔ صفائی ستھرائی کا خیال آ گیا۔ مال مویشی کو انسانوں سے الگ رکھا جانے لگا اور اس طرح سے اس بیماری پر کافی حد تک قابو پایا گیا۔ چند جگہوں میں اس کی طرف اب بھی بھرپور دھیان دینے کی ضرورت ہے۔
اس سلسلے میں راقم نے اس وقت جنوری ۱۹۷۹ء میں اخبار آفتاب کے زریعے حکومت کی توجہ گریز میں بچوں کو درپیش اس اہم پریشانی کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔۔ چونکہ ۱۹۷۹ء کو بچوں کے سال کے طور پر منایا جا رہا تھا۔ ان اخباری تراشوں کی فوٹو کاپی قارئین کی نظر کر رہا ہوں۔

یہاں پر موسم کے مزاج کا خیال رکھتے ہوئے لکڑی کے مکان بنائے جاتے ہیں۔ مگر وقت کے ساتھ اس طرز تعمیر میں بھی کافی تبدیلی آئی ہے۔ اب بھی اکثر مکان لکڑی کے ہی بنتے ہیں۔ مگر اس میں اب ماہر اور تربیت یافتہ کاری گروں نے کچھ تبدیلی لائی ہے اور یہ پہلے مکانوں سے بالکل مختلف اور خوبصورت ہوتے ہیں ان میں جگہ کی بھی کافی گنجائیش موجود ہوتی ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ مزید تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اب کچھ لوگوں نے اینٹ اور پتھر کے مکان بھی بنانے شروع کئے ہیں مگر موسم سرما میں ان مکانوں میں کافی سردی ہوتی ہے۔

وادیٔ گریز

جہاں مائیں اپنے بچے کو دودھ کے بدلے زہر پلاتی ہیں!

چونکہ یہ دوا کو بچوں کی کھانسی کے طور پر دیا جاتا ہے۔ [illegible]

[illegible]

MICRO BACTERIUM TUBER

[illegible] کہا جاتا ہے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

بچوں کا بین الاقوامی سال

اور گوئیز کے بچے

وادی بمبوریت میں بچوں کے سال کے تحت سیمینار اور سمپوزیم منعقد کئے جا رہے ہیں۔ بچوں کے مستقبل کے لئے نئے نئے پروگرام بنائے جا رہے ہیں۔ خصوصاً تندرستی پر زور دئے جا رہے ہیں کہیں مصوری کے مقابلے ہو رہے ہیں مرکزی وزیر انعامات تقسیم کر رہے ہیں۔ کہیں بچوں کے تندرستی پروگراموں کی صدارت [illegible] وزیر کر رہے ہیں [illegible] بھی سال رواں کو بچوں کی بہبود کے سال کے طور پر منایا جا رہا ہے۔

اگر اس سلسلے میں اُن تنظیموں اور اداروں کی توجہ ایک ایسے بدقسمت علاقے کے معصوم بچوں کی طرف مبذول کروائی جائے جہاں ان کا مستقبل روز بروز روشن ہونے کے بجائے تاریک ہوتا جا رہا ہے۔

سری نگر کے شمال مشرق میں [illegible]

[illegible]

لقبہ آپکی رائے آپکی باتیں

[illegible]

[illegible] بیماری اپنے بچے بیماروں سے

[illegible]

[illegible] تپ دق کا مریض قرار دیتا ہے۔ جب ایک
ماں کی چھاتی پہ یہ تپ دق کے جراثیم بیٹھ
گئے۔ تو یہی ماں اس چھاتی کا دودھ پلاتی
ہے۔ تو قوم کو مستقبل کا یہ معمار کیا ہو سکتا ہے
[illegible]
دورہ کیا اور قرار دیا تھا کہ اس علاقے میں
تپ دق کی بیماری عام ہے لہذا حکومت کو
چاہئے کہ وہ ہر شہر میں بچوں کے پروگرام
منعقد کرے [illegible]
[illegible]
[illegible] مہلک بیماری ہے تو [illegible]
[illegible]
نجات دلائے

شادی بیاہ۔

شادی بیاہ پرانے زمانے میں بالکل سادہ انداز میں ہوا کرتے تھے۔ رشتہ داریاں اکثر نزدیکی رشتوں میں ہی طے ہوا کرتی تھیں۔ اکثر لوگ اپنے قریبی رشتہ داروں میں ہی بیٹے بیٹیوں کے رشتے طے کرتے تھے۔ دور کے گاؤں میں مشکل سے ہی رشتہ دیا جاتا تھا۔ چونکہ آبادی کم تھی۔ راستے دشوار گذار تھے سرما کافی لمبا ہوتا تھا۔ اسلئے آنا جانا خاص کر سردیوں میں بالکل کم ہوتا تھا۔ اسلئے لوگ آپسی رشتوں اور بالکل قریبی گاؤں میں ہی رشتوں کو ترجیح دیتے تھے۔ اب اس میں بھی کافی بدلاؤ آگیا ہے۔ راستے وغیرہ بننے سے اور آبادی کے بڑھنے سے تعلیم کے عام ہونے سے اب لوگ رشتے کافی غور و خوض اور کھوج کے بعد ہی کرتے ہیں۔

شادی نہایت سادگی کے ساتھ انجام دی جاتی تھی۔ منگنی کی رسم میں بالکل کوئی خرچہ وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ زبانی پیغام پر ہی رشتے طے ہوا کرتے تھے۔ رشتے طے ہونے کے بعد عیدوں کے موقوں پر دونوں گھر اگر نزدیک تھے تو ایک دوسرے کو کھانا وغیرہ بھجدیتے تھے اس سے لوگوں کو پتہ چلتا تھا کہ انہوں نے رشتہ جوڑا ہے۔ اس کھانے میں بھی کسی قسم کا کوئی تکلف وغیرہ نہیں کیا جاتا تھا جو کھانا وغیرہ اپنے عیال کے لئے پکا ہوتا تھا اسی سے ایک ترامی وغیرہ میں کھانا اور ایک آدھ گھر کا مُرغا یا کچھ گھی وغیرہ بھجدیا جاتا تھا اور گھر کی ہی کوئی بہو بیٹی لیکر جاتی تھی۔ نکاح کی تاریخ طے ہوتے ہی رشتے دار ہونے والے دولہے، دلہن کو باری باری اپنے گھر پر کھانے کی دعوت کرتے تھے یہ سلسلہ ہفتے دس دن چلتا تھا اور نکاح سے پہلے لڑکی کو دو تین دن مایوں بٹھایا جاتا تھا۔ گاؤں کی سب عورتیں کم از کم دو رات دلہن کے پاس جمع ہو کر گایا کرتی تھیں۔ یہ سلسلہ لڑکے کے پاس بھی برابر چلتا تھا۔ اور اس دوران گانے والوں کے

لئے خصوصی طور چائے۔ قہوہ کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اس کے لئے ایک خاص نام تھا (رَتون) یہ کشمیری لفظ ہے۔ ''رَتسون''۔ ''رت جگا'' یہ لفظ کشمیری تہذیب سے آیا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے راتوں کو جاگنا اور کسی خاص بات پر غور وفکر کرنا۔ (ون) (ون دین کشمیری میں) یہی کچھ اسی قسم کا مطلب نکلتا ہے۔ اس سب کا پس منظر صرف اس نکاح یعنی شادی کی خبر عام لوگوں تک پہنچانا ہوتا تھا۔ کیونکہ اسلام میں نکاح کا پیغام اور خبر عام لوگوں تک پہنچانا سُنت ہے۔ اور پرانے لوگوں نے اسی طرح گانا وغیرہ گانے کو ہی اطلاع عام کا زریعہ بنایا ہوا تھا۔

شادی میں کپڑے اور زیور۔

دلہن کے لئے نئے کپڑوں کے چند جوڑے بنائے جاتے تھے چونکہ لوگ اکثر غریب تھے۔ سوتی کپڑوں کے دو ایک جوڑوں پر ہی گذارا کیا جاتا تھا۔ مگر پٹو کا ایک پھرن دلہن کے لئے لازمی طور پر بنایا جاتا تھا یہ گھر پر بنے ہوئے سفید پٹو کا بنایا جاتا تھا۔ اور پھرن سلانے کے بعد اس کو سرخ رنگ میں رنگ لیا جاتا تھا۔ اس کے گلے میں کالے دھاگے سے دو تین لائینوں میں ایمبر ائڈری قسم کا کام کیا جاتا تھا جس سے اس پھرن میں تھوڑی خوبصورتی بڑھ جاتی تھی۔ اس پھرن کو ''قِرمزو'' کہتے تھے۔ یہ کشمیری لفظ قِرمز سے نکلا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ زیور ضرور بنایا جاتا تھا۔ جو صرف چاندی کا ہی ہوا کرتا تھا۔ سونے کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ زیور میں استعمال ہونے والی چند چیزوں کے نام کچھ اس طرح سے ہیں۔

۱۔ کانٹھ مال۔ ایک حلقہ نما شے جو تقریباً تین انچ چوڑا اور چھ سے آٹھ انچ لمبا ہوتا تھا۔ گلے میں ڈالدا جاتا تھا۔

۲۔ تائعید۔ تکونی شکل کا چاندی کا ایک ٹکڑا ہوتا تھا جسے قصابہ

کے ساتھ بند کیا جاتا تھا۔ اور دلہن کے ماتھے پر
لٹکایا جاتا تھا۔

۳۔ تراٹو۔ یہ ایک لمبی سے مالا ہوتی تھی جس میں چاندی کے گول گول تین انچ کے ٹکڑے ہوتے تھے۔ تقریباً آٹھ دس ٹکڑوں سے بنائی ہوئی یہ مالا گلے میں ڈالی جاتی تھی۔

۴۔ بنگوے۔ یہ تو چوڑیوں کی طرح ہی ہوتی تھیں۔ چوڑیاں پتلی اور گول ہوتی ہیں۔ یہ کچھ چوڑی اور وزنی ہوا کرتی تھیں۔ کلائیوں میں ڈالی جاتی تھیں۔

یہ زیور تقریباً ستھر (۷۰) کی دہائی کے اواخر تک باقاعدہ استعمال ہوتے تھے مگر جوں جوں عورتوں میں تعلیم کا نور پھیلتا گیا۔ اس میں بھی کمی آنے لگی۔ لڑکیوں نے ازخود اس کو ترک کر دیا۔ اور اس وقت یہ چیزیں دیکھنے کو بھی نہیں ملتی ہیں۔ اور آہستہ آہستہ اب اس کی جگہ سونے کے زیورات آنے لگے۔

شادیوں میں خرچہ وغیرہ بہت ہی مختصر ہوتا تھا۔ نکاح کے موقعہ پر برات کے ساتھ کچھ لوگ دلہن کے گھر آتے تھے۔ جن کے لئے دن کے کھانے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ کھانے میں دو سالن ہوا کرتے تھے۔ ایک گوشت، اور ایک شلغم، برات میں زیادہ سے زیادہ بیس۔ پچیس لوگ شامل ہوا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ تقریباً اسی (۸۰) کی دہائی کے اواخر تک چلتا تھا۔

اسی (۸۰) کی دہائی میں تقریباً گریز میں ہر گھر میں تھوڑی بہت خوشحالی ضرور آئی تھی۔ اکثر لوگ ملازم بنے تھے۔ اور جو ملازم نہیں تھے وہ مزدوری وغیرہ

کر کے اپنا گذارہ بہتر طریقے سے کرنے لگے تھے۔ اس لئے اب اور چیزوں کے ساتھ ساتھ شادی بیاہ کے اخراجات میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ اب شادی میں وازوان کا رواج شروع ہوا سالنوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ کپڑوں میں اور زیور میں زبردست مقابلہ آرائی شروع ہوگئی۔ اس وقت وادی کشمیر کی طرح یہاں بھی فضول خرچی عام ہوگئی ہے۔ شادی بیاہ کی تقریبات کم از کم ہفتہ بھر تو ضرور چلتی ہیں۔ ان فضول خرچیوں پر آئے دن مساجد اور دیگر جگہوں پر بحث وتمحیث ضرور ہوتی ہے مگر اس میں برابر اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ بدعات اور غیر شرعی افعال کی حوصلہ افزائی برابر بڑھ رہی ہے۔

زراعت۔

یہاں کی آبادی کا عام پیشہ زمینداری ہوا کرتا تھا۔ آبادی کے تمام لوگوں کے پاس کاشتکاری کے لئے کچھ رقبہ ضرور ہوا کرتا تھا۔ زمینداری کے لئے وقت بالکل کم ملنے کی وجہ سے یہاں پر چند مخصوص اقسام کی فصل اُگائی جاتی ہے۔ جس میں آلو، مکئی، چنیا، جَو، گندم، ترنبہ قابل ذکر ہیں۔ پہلے زمانے میں آلو کی پیداوار زیادہ ہوتی تھی۔ باقی کا دارومدار موسم پر ہوتا تھا۔ مکئی دیسی قسم کی ہوا کرتی تھی جس کی پیداوار بالکل کم ہوتی تھی۔ اس کا بوٹا عام مکئی سے چھوٹا ہوتا ہے۔ دانے بھی چھوٹے ہوتے ہیں مگر مزا خوب ہوتا ہے۔ چنیا، پہلے زمانے میں اکثر بویا جاتا تھا۔ پیداوار بھی کافی ہوا کرتی تھی۔ یہ شالی کی طرح ہوا کرتی ہے۔ مگر پودا اس کا شالی کی طرح لمبا نہیں ہوتا ہے۔ اس کا آدھا ہوتا ہے۔ اس کو دانے الگ کرنے کے لئے کھلیان میں ڈالا جاتا ہے۔ اور مخصوص انداز میں اس کے دانے گھاس سے الگ کئے جاتے ہیں پھر دانے جو شالی سے بالکل چھوٹے ہوتے ہیں۔ اوکلی میں ڈالے جاتے ہیں اور کوٹ کر صاف کئے جاتے ہیں۔ اس کا رنگ مخصوص ہوتا ہے۔ یہ زاعفرانی رنگ کا ہوتا ہے۔ اور کھانا بھی

اس کا بالکل زاعفرانی رنگ کا بنتا ہے۔ نہایت ہی لذیذ ہوتا ہے۔ اکثر دال اور دہی کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ مگر افسوس اب لگ بھگ ناپید ہو چکا ہے۔ جو، گندم کی طرح دانے ہوتے ہیں۔ رنگ تھوڑا بھورا ہوتا ہے۔ نہایت لذیذ ہوتا ہے۔ اس کو صاف کر کے بالکل گندم کی طرح چکی میں پیسا جاتا ہے اور روٹی بنائی جاتی ہے۔ پیشاب کی خرابی میں اس کو دوائی کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس میں Diuretic صفت پائی جاتی ہے۔ مگر اب تُلیل کے چند ایک گاؤں تک ہی محدود ہوا ہے۔ ترنبہ یہ بھی ایک خاص فصل ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ میٹھا ترنبہ اور کڑوا ترنبہ۔ میٹھا ترنبہ دانہ الگ کر کے پیسا جاتا ہے۔ اور اس کی روٹی بنائی جاتی ہے۔ اکثر دلیہ بنایا جاتا ہے اور دودھ میں اُبال کر کھانے میں بہت ہی لذیذ لگتا ہے۔ کڑوا ترنبہ۔ اس کو پیس کر صاف کر کے خمیر بنایا جاتا ہے۔ اور پھر اس کی ایک مخصوص قسم کی روٹی بنائی جاتی ہے۔ یہ خمیری روٹی ہاضمہ کے لئے نہایت مفید رہتی ہے۔ یہ لمبے عرصے تک محفوظ بھی رکھی جاتی ہے۔ شہد کے ساتھ خوب کھائی جاتی ہے۔ اگر اس سے خمیر کے بغیر روٹی بنائیں تو یہ بہت ہی کڑوی ہوتی ہے۔ مگر یہ کڑوی روٹی معدے کے مریضوں کے لئے مفید ہوتی ہے۔ اس سے معدے میں تیزاب کم ہوتا ہے۔ یہ کھٹے ڈکار روکتی ہے۔ جب سے گریز میں محکمہ زراعت کے ماہر آئے ہیں تب سے پرانی اور اصلی فصلیں کم ہو گیئں ہیں اور نئی اور اعلیٰ قسم کی فصلیں اُگائی جانے لگی ہیں۔ جو کی جگہ گندم نے لے لی ہے۔ سفید مکئی اور راجماش بھی کافی اُگائی جاتی ہے۔ آلو کے بعد راجماش کی زیادہ پیداوار لگائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سبزیاں بھی اچھی تعداد میں بوئی جاتی ہیں۔ مگر گریز میں فصلوں کا دارومدار موسم کے مزاج پر ہی قائم ہے۔ زمینداری کے علاوہ لوگ گھروں میں مال مویشی بھی پالتے ہیں۔ پہلے زمانے میں ہر گھر میں بیس (۲۰) تیس (۳۰)

بھیڑ بکری اور دو چار مویشی ضرور ہوا کرتے تھے۔ چونکہ گھاس کافی پائی جاتی تھی ہر گھر میں دودھ اور گھی وافر مقدار میں پایا جاتا تھا۔ پرانے زمانے میں بازار سے تیل وغیرہ کم ہی خریدا جاتا تھا۔ اکثر لوگ دودھ اور گھی کا ہی استعمال کرتے تھے۔ مگر جوں جوں تعلیم عام ہوتی گئی لوگوں نے مال مویشی بھی کم کرنے شروع کئے اور آہستہ آہستہ ان کی تعداد اب بالکل کم ہو چکی ہے۔ اگر اس کی طرف دھیان نہ دیا گیا تو آنے والے سالوں میں شاید یہاں مال مویشی کی تعداد برائے نام ہی رہ جائے گی۔

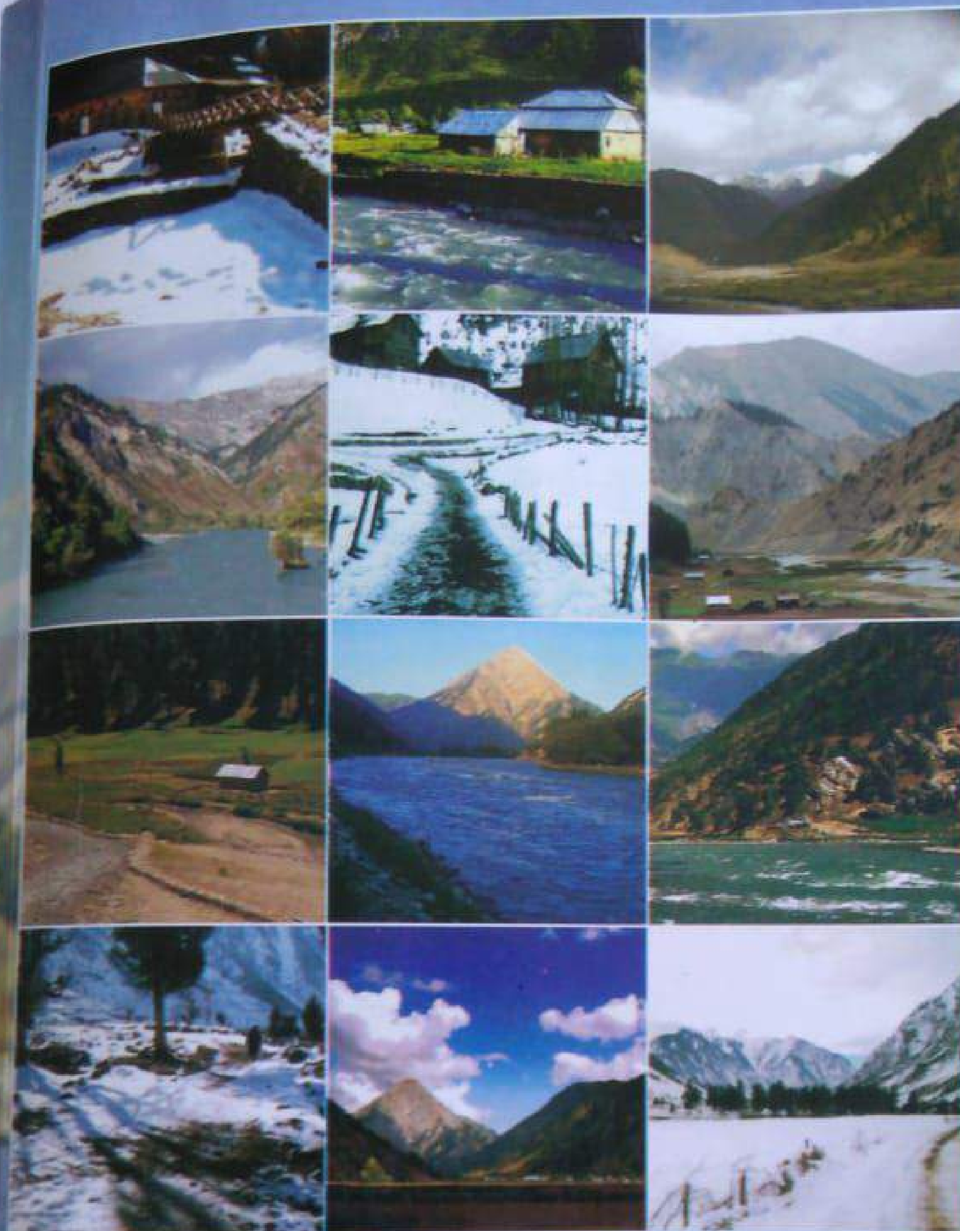
جڑی بوٹیاں۔

گریز قدرتی جڑی بوٹیاں جن میں کٹھ، پتریس، کہہ زبان اور خصوصاً زیرہ جو دنیا بھر میں مشہور ہے اس علاقے کی اہمیت کو اُجاگر کرتیں ہیں۔ زیرہ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے (SKUAST) نے بھی اس میں کافی دلچسپی دکھائی ہے۔ اور کہیں ایک جگہوں میں اس کی باضابط کاشت ہو رہی ہے۔

سیاحت۔

اگرچہ ریاست جموں وکشمیر کی معشیت کا اہم حصہ سیاحت ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ حکومت نے وادی گریز کو سیاحت کے نقشے میں لانے کے لئے اتنی دیر کیوں کر دی "Trout Angling" "River rafting" اور "Trecking" کیلئے شاید ہی ریاست کا کوئی اور حصہ اتنی کشش کا حامل ہو۔

******





Designed & Printed By :

JNI Enterprises.

1st Flr. Haroon Complex, Exchange Road,
Lal Chowk, Srinagar.
Phone : 09419517287, 2458122